

گلے قرین

قیر کا طلب سلیپ ٹھانے

آرکیمہ میرزا



”کھنی سننی“

کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت بھی عجیب ہے اگر اس کے ساتھ کوئی نیکی کر لے تو اس کے معاوضے کے لئے سالہا سال بھی تیار نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی بُرائی کی جائے تو جلد از جلد انتقام لینا چاہتا ہے۔ بدی کے مقامات کا جذبہ اس کے دل میں بہت جلدی پیدا ہوتا ہے اور بُری طرح پیدا ہوتا ہے انتقام کا جنم اس کے حواس کو باطل کر دیتا ہے آسانی فرشتے ”واغفو وأصلصخواً کی صدا بلند کرتے ہیں اور والکنا ظمین الغیظ کے نعرے لگاتے ہیں لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔

بس اس کا میلان انتقام کی طرف اکساتا رہتا ہے اور یوں یہ سلسلہ سا چل لگتا ہے جو کبھی صدیوں تک بھی چلتا ہے یوں انتقام لینے والا بُرائی کرنے والے سے زیادہ بدتر بن ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو انتقام لینے کے بعد روح کو قورائیں آتا۔ وہ مسرت نہیں ملتی۔ جس کی اسے طلب ہوتی ہے۔ وہ پورا انتقام نہ لے کر بھی اضطرابی اذیت میں مبتلا رہتا ہے اور پورا انتقام لے کر کچھ تباہی کی آگ اسے چھین نہیں لینے دیتی۔ لہٰذا انتقامی کارروائی ایسا زہریلا مادہ ہے جو خود اپنے اوپر ہی اثر کرتا ہے اس سے بچنا چاہئے۔ اور یقین کریں میں نے آج تک انتقام لینے والے کو کبھی آسودہ اور مطمئن نہیں دیکھا۔ آسودگی اور طمانیت بھلا اور درگزر میں ہے اگر لوگوں کو بھرپور محنت کی عادت ہو جائے تبھی وہ واقف ہو جائیں گے۔

در عفو لذت نیست کہ در انتقام نیست

ایک جنگ میں حضرت علیؑ اپنے دشمن کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ قریب تھا کہ اسے خنجر سے قتل کر دیں کہ دشمن نے آپ کے روئے مبارک پر ٹھوک دیا، آپ فوراً اس کے سینے سے اتر آئے دشمن نے اس غیر متوقع اور بے گل ہمدردی کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا ”پہلے تم سے خدا کے لیے دشمنی تھی۔ اب ذاتی غصہ اور انتقام کا نتیجہ ہوئی۔ عفو اسلامی کی اس مثال سے وہ شخص مسلمان ہو کر کفار کے ساتھ لڑا رہا۔

یہ کتاب میر کی ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ انتقام کا سزا ایک مسلسل اذیت کا سفر ہے آپ انتقام لے رہے ہیں یا لینے کا سوچ رہے ہیں دونوں حالتوں میں بے کوئی آپ کا مقدر بن جاتی ہے۔ دنیا بہت مختصر ہے اسے آگ کی نذر کرنے کی بجائے محبت کے لہلہاتے کھیت بنائے۔ محبت کا بیج بو کر دیکھئے۔ چھاؤں بھر اور دست اُگتا چلا جائے گا۔

زیر مطالعہ ناول ”تیری طلب کے سیپ اٹھائے“ ماہنامہ آن لائن کراچی میں قسط وار شائع ہونے کے بعد کتابی صورت میں چھپ کر آیا جا رہا ہے..... اس کی پسند اور ناپسند کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

کیا میں امید رکھوں کہ آپ مجھے ”تیری طلب کے سیپ اٹھائے“ کے بارے میں اپنی تنقیدی اور تقریقی آرا سے (معرفت پبلشر) ارسال فرمائیں گے؟۔

مخلص

آسیہ مرزا

کھٹناک سے دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ایزل سے نظریں ہٹا کر دروازے کی
سست دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے پروا انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔
”کتنی دفعہ کہا ہے دروازہ ناک کر کے آیا کرو۔“
اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے برش ٹرے میں رکھ دیا۔
”اور کتنی دفعہ کہوں کہ اس طرح بغیر ناک کئے آنے میں کیا قہاحت ہے آخر؟“
وہ اطمینان سے بولی۔ پھر مسکین سی صورت بنا کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔
”سوری عمر بھائی۔ چنانہیں کیوں میں ہر بار آپ کی تاکید بھول جاتی ہوں۔ شاید
یادداشت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اسی لئے تو اُمی کہتی رہتی ہیں حریرہ پیا کرو۔“
اس کی آنکھوں کی تہوں میں شرارت چل رہی تھی اور خوش نما ہونٹوں پر معصوم سی
مسکراہٹ بھی۔

اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ البتہ اسی بنجیدگی سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”کیا کام ہے؟ کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے؟“

”آپ بھول گئے۔ میں نے رات فون پر آپ کو بتایا تھا۔“ وہ اس کی بے خبری پر برامان کر بولی۔ مگر وہ ہنوز انجان بلکہ غائب دماغی سے کھڑے اٹکتا رہا۔

”افوہ۔ بتایا تو تھا کہ ہمارے کانچ میں اسٹوڈنٹ ویک منایا جا رہا ہے اور اس میں سب ہی اپنے اپنے مہمان لارہی ہیں۔ میرے ساتھ می اور پاپا تو نہیں آئیں گے۔ لازماً آپ کو آنا ہے۔ بلکہ ہر حال میں۔ دیکھیں میں انکار نہیں سنوں گی۔“ اس نے اسے مزید بولنے سے ٹوک دیا۔

”میں نے تم سے غالباً فون پر ہی معذرت کر لی تھی۔ کیا کمی ہے تمہارے پاس لوگوں کی۔ دو دو ہیال بھرا پڑا ہے تمہارا۔ رنگ برنگے لوگوں سے“ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”مجھے ان رنگ برنگے لوگوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس میں آپ کو لے جانا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کے صاف ستھرے کھڑے بیڈ پر پاؤں چڑھا کر بیٹھ گئی اور ٹکیہ گود میں دبایا۔ گویا اس کا کھٹکے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی اس بے وقت کی مداخلت پر ڈسٹرب ہوا تھا اور اسے وہ بھند تھی ایسے کام پر جو اسے کم از کم وقت کا زیاں اور اپنے مزاج کے خلاف دکھائی دے رہا تھا۔

”عینیہ پلیز!“

”نو پلیز!“ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا دیا۔ پھر ٹکیہ اپنے آگے زور سے پٹخ کر

اس پر مکا مارتے ہوئے بولی۔ ”آخر آپ میری بات مانتے کیوں نہیں ہیں۔ کبھی ٹھیک ہے آپ نہیں آتے تو نہ آئیں۔ میں بھی نہیں جاتی۔ بھلے سے میری فرینڈز مجھے قتل کر دیں۔“

وہ اس کی بچکانہ بات پر مسکرا کر رہ گیا۔

”میری ساری فرینڈز آپ سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ اسی لئے تو میں آپ کو لے جانا چاہتی ہوں۔“ وہ دونوں پیر بیڈ سے لٹکا کر بیٹھ گئی اور ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے انہیں بتایا تھا کہ آپ ایک بہترین مصور ہیں۔ فاریہ آپ کی تصاویر کی نمائش انجمن میں دیکھ چکی ہے تب سے وہ غائبانہ آپ سے انتہائی متاثر ہو بیٹھی ہے۔“

عینیہ کی یہ باتیں اس کے لئے کسی قسم کی خوشی و مسرت کا باعث نہ تھیں۔

”آپ کو پتا ہے لڑکیاں تو اپنے کزنز کو شومارنے کے لئے لے آتی ہیں۔ ایمان سے عمر بھائی۔ آپ میرے ساتھ آئیں گے تا تو یہ فاری لوگ تو جل کر رہ جائیں گی۔“

”تو تم کیوں جانا چاہتی ہو انہیں۔“ وہ اسکی کسی بات کو سیریس نہ لے رہا تھا۔ وہ برامان کر انہیں گھورنے لگی۔ پھر پلکیں جھپک کر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

”ایک بار وہ بھی اپنے سڑے سے کزن کو لے کر آئی تھی اور خوب شامارتی رہی تھی۔ آپ تو اتنے ڈیٹسٹ۔ اتنے امارت ہیں۔ کیا میرا ذرا بھی حق نہیں بنتا شو آف کرنے کا۔“

پتا نہیں وہ اس کی اتنی دیوانی کیوں تھی۔ اسے تو عمر کے چلنے کا بیٹھنے کا مسکرانے کا ہر ہر انداز پسند تھا۔ نہ جانے وہ کون کون سی خوبیاں اسکی بیان کرتی۔ مگر وہ قطعاً خوش نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی بچپن کے بوئے سبب اب اندر سے تناور درخت بن چکے تھے۔ خوش فہمی کا کوئی جھوٹا کانا نہیں جھنجھوڑتا تھا۔

”تم فہد کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی کزن ہے تمہارا۔ اور پھر اسے اس طرح کے فنکشن اٹینڈ کرنے کا تجربہ بھی ہے اور اس طرح کی گید رنگ وہ پسند بھی کرتا ہے۔ اسے انجوائے کرتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ تم بھی انجوائے کرو گی۔“ وہ دراز کھول کر سگریٹ کا

اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”میں آپ کا یہ بھرنہیں بھولوں گی۔ میرا خیال ہے آپ نے زندگی میں پہلی بار میرا مان رکھا ہے۔ میں کس قدر خوش ہوں آپ شاید اندازہ نہیں کر سکتے۔ تھینک یو عمر بھائی۔“

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اور وہ ہونٹ پیچھے دروازے کو تکتا رہ گیا۔



راستے بھر وہ اس کے کان کھاتی رہی پھر کسٹ پلیئر میں کسٹ اٹھا کر لگا دی۔ ”کیا کر رہی ہو۔ بند کرو اسے۔“ وہ اسے ڈانٹنے لگا مگر ہنوز اس غزل کی طرف متوجہ رہی۔

ع کون کہتا ہے محبت کی زبان ہوتی ہے

یہ حقیقت تو نگاہوں سے بیان ہوتی ہے

وہ نہ آنس تو ستاتی ہے خلش سی دل کو

وہ جو آنس تو خلش اور جواں ہوتی ہے

عینہ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آتا تھا مگر اسے لگا خود اس کا اطمینان کھڑ گیا

ہو۔ اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر آف کرنا چاہا تو وہ جتنی ہو کر جلدی سے بولی۔

”رہنے دیں نا پلیز“ پھر دھیرے سے بولی۔ ”مجھے بھی تو پتا چلے آپ کی چوئس

کا۔ آپ تو اس بند کتاب کی طرح ہیں جو کھلتی ہی نہیں ہے“ جیسے کوئی پرسل ڈانری۔ جسے کھولنے کی کوئی ہمت نہ کر سکے۔“

اس کا ہاتھ ٹھٹک کر رہ گیا وہ بے ارادہ ہی اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جو کیسٹ سے نکلنے

والی غزل میں محو تھی۔ یا پھر دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ مگر اسے لگا جیسے

پیکٹ تلاش کرنے لگا اور جو نبی پیکٹ اٹھانے لگا اس نے لپک کر وہ جھپٹ لیا اور جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ اچھی طرح واقف تھی یہ شے اس شخص کی کمزوری تھی۔

”عینہ پلیز۔ تنگ نہ کرو۔“ وہ جیسے عاجز آ گیا۔

کچھ ہتھلاہٹ اس کے چہرے پر بھی سٹ آئی۔ وہ کھل کھلا پڑی۔

شفاف تر و تازہ اور گفٹ ہنسی نے نکلے بھر کے لئے کمرے کے سکوت میں ہلچل مچا دی۔ اس خوبصورت ہنسی نے مسمو کر فضا تان دی۔

”فہدی کو لے جانا ہوتا تو میں آپ کا سر کیوں کھا رہی ہوتی۔ وہ میری فریڈز سے الٹی سیدی ہو اس کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے نہیں لے جانا اسے۔“

پتا نہیں کیوں اسے گور سے پنے فہد میں کوئی متاثر کن بات نہیں لگتی تھی۔ یہ تو امی ہی تھیں جو اس کے گیت الاپتی رہتی تھیں۔ اس کی گھر آنے پر خاطر مدارت کرنے بیٹھ جاتیں۔ ان کا بس چلنا تو آسمان کے تارے توڑ کر اس کے قدموں میں بچھا دیتیں۔

”فہد صرف شرارتی ہے۔ یقین کر دو تم اس کے ساتھ انجوائے کرو گی۔“

”ضرور کروں گی۔ مگر میں کل آپ کو لے جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”اچھا۔ بابا جیسی تمہاری مرضی۔ اب یہ پیکٹ تو ادھر دو۔“ اس نے ہتھلا کر رضا مندی دے دی اور ہاتھ آگے کر دیا جس پر اس نے ہستے ہوئے اور تھینک یو کے ساتھ سگریٹ کا پیکٹ رکھ دیا۔ اور پھر ایک گہری طویل قسم کی سانس بھرتے ہوئی بولی۔

”میں تو سوچ رہی تھی کہ ناؤ کا تعاون حاصل کرنا پڑے گا۔ اس پورے گھر میں

آپ ایک انہمی کی بات تو مانتے ہیں اور کچھ کچھ تیور ماموں کی۔“ وہ اس کی سمت شرارت

آ میز انداز میں دیکھ رہی تھی پھر اسکی جان چھوڑتے ہوئے احسان کرنے والے انداز میں

وہ دل ہی دل میں ہنس رہی ہو۔

”ماپوسی ہو گئی تمہیں۔ میری چو اُس جان کر۔“ وہ اسکا بقیہ جملہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ اور آہستگی سے مٹن آف کر دیا۔ جبکہ وہ انکی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے بولی۔

”آپ کی چو اُس آپ کی طرح لا جواب ہے۔“

”میں ایسی باتوں پر خوش نہیں ہوتا۔ میں حقیقت پسند ہوں اور حقیقت ہمیں کوئی بتاتا نہیں ہے وہ خود ہمیں نظر آتی ہے اپنی تمام تر سفاکیوں کے ساتھ۔“ اس کا لہجہ انتہائی کرخت ہو گیا۔ ایسی ہی کرختگی اس کے چہرے پر بھی ایک بیک بھیلی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ عینیہ نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس طرح الجھ جاتی جب وہ اپنی تعریف پر اسی طرح کے رد عمل کا اظہار کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی جھلکنے لگتی اور اس برہمی میں سرخی واضح ہوتی۔

جبکہ فہد اپنی مصنوعی تعریف پر بھی سینہ تان لیتا تھا۔ گردن اکڑا کر فرضی کارل جہاز لگاتے لگتا تھا۔ اور تعریف کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا تھا۔

اس نے چورنگا ہوں سے اسے دیکھا۔ بلیک ٹراڈ زرو ہائٹ شرٹ میں وہ خاصا جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا اسکی ساری کشش آنکھوں میں تھی۔ گہری سنجیدہ تین ذہین آنکھیں۔ جسے وہ عادت کے مطابق ہلکی جھپٹ دیکر مسکرایا کرتا تھا۔ اور ایسے میں اس کی شخصیت میں ایسی دلکشی سمٹ آتی جو عینیہ کو اپنے دل پر قم ہوئی محسوس ہوتی۔

اس کا پورا گروپ چھ شرارتی لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ جو کالج کا ذہن ترین اور حاضر جواب گروپ مانا جاتا تھا۔ تعلیمی میدان میں اول تھا ہی ان سے بہت کر دوسری سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ آگے رہتا تھا۔

وہ عمر کے ساتھ گاڑی سے اتری تو اس کا پورا گروپ دو دروازے پر ہی اس کے استقبال کو کھڑا تھا۔ عمر کچھ جبک سا گیا۔ فطرتاً وہ کم کوادر شرمیلا تھا۔ لڑکیوں سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہ رکھتا تھا۔ اسٹوڈنٹ لائف میں بھی وہ ہمیشہ الگ تھلک رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کم آمیز تھا یا پھر اس کے بچپن کا کوئی کمپلیکس اس کے ہمراہ رہا تھا۔

سیاہ اور سرخ کنٹراس کے ہلکی ایمبرائیڈری والے سوٹ میں عینیہ پر یوں جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی سے اتر کر چلتا ہوا خود کو غیر اعتماد محسوس کرنے لگا۔ عجیب سی بے آرامی اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

”چمن ہنس پڑے“ اور گل مسکرائے

بوا شکر یہ آپ تشریف لائے۔“

وہ پورا گروپ ان کے گرد جمع ہو گیا۔ سب کی نظریں عینیہ کے ویل ڈریس‘ اسارٹ کزن پر تھیں۔ جو باوجود دراز قد ہونے کے ان نازک نازک کامنی مگر شرارتی لڑکیوں کے گھیرے میں آکر خود کو کچھ پریشان سا محسوس کرنے لگا تھا اور وہ سب تھیں بھی ایک سے ایک پناخ۔

عینیہ نے ایمین ملوی کا تعارف کرایا جس نے عمر کو دیکھتے ہی شعر پڑھا تھا۔

”یہ ایمین ہے۔ اسے شاعری کا خطبہ ہے۔ ابھی آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں۔“ اس نے پنک سوٹ پر سفید کڑائی والے دوپٹے میں ملبوس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ستم تو یہ ہے کہ ظالم خن شناس نہیں

وہ اک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اس نے گویا اپنے اس خبا کا مزید ثبوت پیش کیا اور جبکہ کرکورش بجالائی۔ ہر طرف کھل کھلا ہنسیں بکھر گئیں۔

”یہ فار یہ احمد ہے جو اچھی اچھی کتابوں اور خوبصورت تصویروں کی دیوانی ہے۔“
 ”تصویروں کی ہی نہیں تصویر بنانے والوں کی بھی۔“ اس نے جواباً عینہ کو شہو کا مارا
 اور فدیہ یا نہ انداز میں عمر کو دیکھنے لگی۔ وہ تجل سا ہر کو دوسری طرف دیکھنے لگا۔
 ”یہ راجہ رضایاں ہمارے گروپ کی سب سے کم گو۔“ اس نے فار یہ کو چٹکی بھر کر
 مزید تعارف کا مرحلہ آگے بڑھایا۔

”اب اتنی کم گو بھی نہیں ہیں۔“ بقول شاعر

یہ اور بات ہے کہ ممبر پہ آ کے کچھ نہ کہیں

خاموش لوگ بلا کے خطیب ہوتے ہیں

ایمن کی چلبلی فطرت اسے بولنے سے باز نہ رکھ سکی۔ ایک بار پھر اس شریر گروپ
 کی کھل کھلا بیس عمر کے ارد گرد کھڑ گئیں۔ اگر اس وقت فہد ہوتا تو یقیناً انجوائے کرتا۔ مگر وہ
 اپنی فطرت کے خلاف یہ سب برداشت کر رہا تھا۔

”اور یہ میمونہ قریشی میں عرف مونا۔ کھانے پینے کی از حد شوقین اور نیند کی رسیا۔“
 اس نے ایک صحت مند لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جس کا فربہ میاں سراپا از خود اس کے
 دونوں شوق کا ترجمان تھا۔

”یہ عموماً ابن انشاء کے اس شعر کی تفسیر نظر آتی ہیں۔“

نیند ہی نیند ہے آنکھوں میں

اب ہم کو نہ اٹھانا لوگو

”ایم کی بچی۔ تو چپکی نہیں رہے گی۔“ مونانے اسکے بازو میں اپنی مضبوط صحت
 مندا انگلیاں گاڑ دیں۔

وہ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور عمر کا خیال تھا وہ برا پھنسا تھا۔ اس کا ضبط

جواب دے رہا تھا۔

”یعنی اب ان کا تعارف بھی تو کر آؤنا۔“ فار یہ اس کے خاموش ہونے پر بولی۔
 تو اس نے بے ساختہ نظریں عمر پر جمادیں۔ اس کے لبوں کی تراش میں مدہم می مسکراہٹ
 بکھر گئی۔ عجب سا خنار آنکھوں میں بلکروے لیے لگا۔ پھر دھیمے آج دیتے لہجے میں بول۔

ع تم نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ

زندگی جس کے تصور میں لٹا دی ہے ہم نے

اس کا لہجہ خنار آلود تھا۔ لگا ہوں میں والہانہ چمک لیے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
 وہ اس لمحے وہ یقیناً فراموش کر گئی تھی کہ وہ کہ اس وقت کہاں کھڑی ہے۔ کن کے
 درمیان۔ پورا گروپ اوئے اوئے کرنے لگا۔ جبکہ عمر کو لگا اس کے ارد گرد بجلیاں کرکڑ گئی
 ہوں۔ اس کے اعصاب پر زبردست پتھر پڑا تھا۔ اس کی پیشانی یوں جل اٹھی جیسے کسی نے
 جھڑکتے ہوئے شعلوں میں اسے ڈھکیل دیا ہو۔

تم پر ابھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں

تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ایک خود فراموشی اور دماغی کے عالم وہ اسے نکلے جا رہی تھی تب وہ ہونٹ بھیج کر
 آگے آیا پھر نہ جانے کیسے اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔

وہ عالم مدہوش سے عالم خود شای میں چلی آئی تذلیل کے احساس نے اس
 کا چہرہ اور بھی سرخ کر ڈالا۔

”تمہارے ساتھ آ کر میں نے شاید بہت بڑی حماقت کی ہے۔“ وہ اسی اشتعال
 میں ایڑیوں کے بل پلٹا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ دم سادھے وہ اس تذلیل پر ششدر سی کھڑی رہی۔ ہوش آیا تو گیٹ کی طرف

بے ساختہ بھاگی مگر وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور بے حد دردش انداز میں ریورس کر کے سڑک پر دوڑانے لگا۔

اب وہاں مٹی کا بگولا تھا جو فضا میں تحلیل ہو رہا تھا وہ ذلت آمیز کرب میں ڈوبی وہیں کھڑی رہ گئی رخسار الگ سنگ رہا تھا۔

اسے عمر سے ایسے رویے کی امید ہرگز نہ تھی۔ اتنے ٹھنڈے بیٹھے مزاج کا آدمی ایسا رویہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ یوں بھرے مجمع میں اس کی تذلیل کر سکتا تھا۔ وہ حیرت میں مری جا رہی تھی۔

اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ واپس اپنے گرد پ کی طرف پلٹتی۔ اس کی خوش نما آنکھیں یکا یک پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے لب بھینچ کر اس پانی کو پلکوں کی مضبوط باڑھ کے سہارے روکنا چاہا۔

”اب یہیں کھڑی کیا سوگ مناتی رہو گی؟“

وہ پلٹی تو ایمن اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے پلٹنے پر اس کی پھٹکی آنکھوں اور سرخ چہرے کو دیکھ کر اس کا کندھا تھکتے ہوئے بولی۔

”ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی توقع کے خلاف۔ شاید وہ غصے کے تیز ہوں گے۔“

اس نے پلکیں جھکا دیں۔ ہپ۔ ہپ۔ ہپ۔ کئی آنسو آخر کار پلکوں کی باڑھ تو ذکر تپتے ہوئے رخساروں پر کر شل کے موتیوں کی طرح ٹکھڑے گئے۔

”وہ غصے کے تیز نہیں ہیں ایمن۔ تبھی تو مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ وہ ایسے تو نہیں ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

ایمن نے اس کے گرد اپنا بازو ڈال دیا۔

”جو جیسے گتے ہیں نا جنہیں ہم دل و جان سے چاہتے ہیں ان کی ساری کج

ادائیاں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے اس وقت کی واردات کو بھول جاؤ۔ شاید انہیں اپنے کزن ہونے کا زیادہ احساس تھا یا وجہ سے تمہاری یہ جرات اور وہ بھی گھر سے باہر برداشت نہ کر سکے۔“ ایمن نے اسے دلاسا دیا تو اس نے سر جھکا لیا۔

”پتا نہیں۔ بس یہ شخص کبھی کبھی یونی مری کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں انہیں کبھی سمجھ نہیں پاؤں گی“ وہ کندھے پر لٹکتے بیک سے ٹشو نکال کر ناک رگڑنے لگی۔ ایمن ہنس پڑی۔

وہ ایمن کے ساتھ وہیں بیٹھ گئی۔

”وہ شخص تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے“ تمہاری دسترس سے بہت دور دکھائی دیتا ہے۔ یہی تو وہ شعلہ ہے جس پر تم لپک رہی ہو جو شے دسترس سے باہر ہوتی ہے اسی میں تو کشش ہوتی ہے۔

اس کے رخساروں پر سرخنی سہم آئی اور ایمن کھل کھلا پڑی۔

”چلو اب اس بندے کو زیادہ سچڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خبردار اس سے بات مت کرنا۔ اب یہ اس کا فرض ہے کہ وہ تم سے معذرت کرے۔“

پھر وہ آنکھیں میچا تے پھر معنی جیز تسم کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئی کنگنائی۔

اس کو کچھ تو بتا دیا ہے

تم نے تھوڑا سا دھیان دے کر

وہ بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکی تھی۔

”ایمی کی بچی پوری خبیث ہے تو۔“ وہ زور زور سے اس پر کئے برسائے لگی اور

ایمن نے جلدی سے اسی کا شولڈر بیک بطور حفاظتی اقدام کے اپنے آگے رکھ لیا۔

اس نے برش ایک طرف ڈال دیا۔ اور بے زار نظروں سے اپنی ادھوری بینٹنگ کو دیکھنے لگا۔ ایک لحظہ دل چاہا باز اس بارش اٹھا کر سیاہ رنگ میں ڈبو کر اسے بگاڑ دے۔

ہر چیز جس جس کر دے۔

سارے رنگ اس پر اغیل دے۔

یا بھر۔

اس کو ایزل سے اتار کر کلوے کلوے کر دے۔

مگر دوسرے پل اشتعال انگیز جذبے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اس نے اضطرابی انداز میں ایزل کا پردہ گرادیا۔

وہ دورا ہا بھی آ گیا امجد

جس کا دھڑکا تھا ابتداء سے ہی

اس کے اندر اضطراب کی لہریں پھوٹ پڑیں۔ وہ نادان یا کم فہم نہیں تھا کہ آنکھوں کے وہ رنگ نہ پچانتا جو عینہ کی آنکھوں کے اندر نکھرے ہوئے تھے۔

وہ جذبہ جو شل مہتاب دل کے آسمان سے ابھرتا ہے اور آنکھوں میں شفق بن کر نکھر جاتا ہے۔

ایسی ہی شفق اس نے عینہ کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔

وہ سخت مضطرب ہو رہا تھا۔ جس حد شے کی آہٹ محسوس کر رہا تھا وہ بے حد زرد یک چلا آیا تھا۔

اس کے اندر جیسے پت جھڑکا موسم اترنے لگا۔ دماغ انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔

ہر سوچ میں ذہن بن کر لگ رہی تھی۔

وہ اپنی ہی سوچوں کے اس زیروم سے گھبرا کر کمرے سے نکل آیا۔ جہاں ایک پر

روشن دنیا آباد تھی۔ پتا نہیں اس کے لئے قہمی یا نہیں۔

صغریٰ (ملازمہ لڑکی) نے اسے شام کی چائے دی تو وہ گک لیے اماں جان کے کمرے میں چلا آیا۔

”چلو تمہاری بھی شکل نظر آئی۔ ترس جاتی ہوں میں تو تمہاری صورت دیکھنے کو۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولیں اور اس نے عادت کے مطابق صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور ان کے تحت پران سے لگ کر بیٹھ گیا۔

”ایک دن ہی تو چھٹی کا ہوتا ہے دادی جان۔“

”اور وہ بھی۔ تم کمرے میں بند ہو کر گزار دیتے ہو۔ تم عمر یونہی میرا دل جلاتے رہو؟“ انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھ دی اور صغریٰ کے ہاتھ سے چائے کا گک تمام لیا۔

”میں تو پوری کوشش کرتا ہوں دادی جان کہ آپ کا دل نہ جلے۔“ وہ نرم نیچے نیس

بولتا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔“ اماں جان نے اسے گھور کر دیکھا وہ چائے کے گک سے اٹھتے دھواں پر نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔

”آپ جانتی ہیں میں کتنا کم مذاق کرتا ہوں۔“

اس نے سر اٹھا کر دیکھا پھر جیسے ان کی محبت سے پگھل گیا۔ عجیب بے بسی کا احساس اندر سے اسے جکڑنے لگا۔

”کیوں جلاتی ہیں آپ اپنا دل۔ دادی جان ضروری نہیں کہ ہر با اختیار نظر آنے والا شخص اتنا ہی با اختیار بھی ہو۔ دل پر تو کسی کا اختیار نہیں چلتا ناں۔ آپ کو مجھ سے محبت

ہے..... ہے نا۔ آپ مجھ سے نفرت کیوں نہیں کرتیں اس لئے ناں کہ آپ کے یہ اختیار میں نہیں ہے۔ آپ چاہیں گی بھی تو مجھ سے نفرت نہیں کر سکیں گی۔“ اس نے لاڈ بھرے

لہجے میں کہا اور ان کے کندھے پر سر ٹکالیا۔

”کیا کوئی لڑکی تمہیں پسند ہے؟“ انہوں نے پیار سے اس کے گھٹنے بالوں کو سہلایا۔ وہ چائے ختم کر کے ان کی گود میں سر ڈال کر تخت پر پھیل کر لیٹ گیا اور ان کی اس بات پر ہنسنے لگا۔

”مجھے پتا تھا میرے انکار پر یہی سوال اٹھائیں گی آپ۔ سوئیٹ دادی۔ اگر پسند ہوتی تو آپ کو بتانا چکا ہوتا۔ میری شادی سے انکار کا جواز ہرگز کوئی لڑکی نہیں۔ اور سنیچے یہ کسی صحیفے میں تھا نہ آسمان سے اترا ہے کہ پہلے بڑے بھائی کی ہی شادی ہو پھر چھوٹے کی۔ آپ اور ماما بخوشی فہد کی شادی کر سکتی ہیں۔“ وہ ان کی تسبیح سے کھیلنے لگا۔

”ہاں..... ہاں“ تو پڑھ لکھ کر ہم سے زیادہ سمجھدار ہو گیا ہے۔ اب تو ہمیں سکھائے گا سمجھائے گا۔“ انہوں نے گھور کر دیکھا۔ ان کے چہرے کے زاویوں میں خشکی سمٹ آئی۔ ”ٹھیک ہے یہ اصول اللہ کے بنائے ہوئے نہیں ہیں مگر ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس معاشرے کے کچھ اصول ہیں کچھ اچھے یا برے انسانوں کے بنائے ہوئے اور یہ کوئی اتنا برا اصول بھی نہیں ہے۔ اتنی خراب روایت بھی نہیں ہے کہ پہلے شادی بڑے کی ہو اور جب کوئی انکار کا سبب بھی نہ ہو۔ کیوں ضد لے کر بیٹھا ہے۔ میری بوزھی آنکھیں جانے کب بند ہو جائیں۔ تیری خوشی ہی دیکھنے کو تو زندہ ہوں اب تک۔“ ان کی لرزتی انگلیاں اس کے بالوں میں پھسلنے لگیں۔ وہ چپ سا ہو کر چھت کو گھورنے لگا۔

”اماں۔ اب آپ ہی سمجھائیے نا۔ تیور کو۔“ شمن دوپٹا دھاگے اور کروشیا اٹھائے اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ایک نظر عمر پر ڈالی مگر اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی وہ شمن کی آواز سن کر بھی یونہی جپ بڑا چھت کو گھورتا رہا۔ البتہ اماں شمن کی مست ضرور متوجہ ہوئی تھیں۔

”کیا ہو گیا۔ کس بات پر سمجھاتا ہے؟“

”یونہی فہد کے معاملے میں تنگ دل ہو رہے ہیں۔“ وہ دوپٹا کھول کر کنارہ پکڑ کر اس پر دھاگا لپیٹنے لگیں۔

”دو سال کی تو بات ہے۔ یوں چنگی بجاتے گزر جائیں گے دو سال وہ پڑھ لے گا۔ کہتا ہے یہاں جاب اور آپ اچھی مل سکتی ہے۔ اختر بھائی بھی تو انگریزڈ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے تو کہہ بھی دیا ہے فہد کو سمجھ دیجئے۔ باقی وہ سب سنبھال لیں گے۔ اور پ تو جانتی ہیں اختر بھائی میرے سسے بھائی جیسے ہیں۔“

ان کی بات سن کر اماں جاننے چائے گاگ ایک طرف رکھا پھر چشمہ آنکھوں سے ہٹا کر دوپٹے کے کتر سے صاف کرنے لگیں۔

”میں جانتی ہوں آپ بھی۔ اس معاملے میں چپ رہیں گی۔“ ان کی خاموشی پر شمن نے شکایتی لہجے میں کہا تو اماں نے جواباً انہیں دیکھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ فہد کا باپ ہے جو بھی سوچے گا اس کی بہتری کے لئے ہی ہوگا۔ اور پھر تیور کچھ غلط انکار بھی نہیں کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے ابھی اسے یہاں پر اچھی جاب مل رہی ہے ایک سال کر لے پھر خیر سے شادی کے بعد بیوی کو لے کر دو سال تو کیا تین سال بھی گزار آئے انگریزڈ میں۔“ انہوں نے تیور کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”اوہو اماں“ تو کون سا فہد کے لئے ہمیں لڑکیاں تلاش کرنے میں جوتے گھسنے پڑیں گے خیر سے گھر کی لڑکی ہے۔“

”شمن۔ شمن۔ تم کسی قدر کم عقل عورت ہو۔

کیوں بیٹے کو نکلا ہوں سے دور بھیجتا جانتی ہو۔“ انہوں نے جیسے اٹھا چیا اور اسکی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔

”صرف اس کے بہتر مستقبل کے لئے۔“ ان کی انگلیاں تیزی سے دوپٹے کے کنارے پر اطمینان سے تیل بناتی جا رہی تھیں۔ ان کے لبوں پر ہند کے لئے پیار بھری مسکراہٹ تھی۔

”خمیک ہے تو وہ سال بھر بعد بھی جا سکتا ہے۔“

”مگر وہ نہیں مانتا۔“ انہوں نے اپنا حرکت کرتا ہاتھ روک کر بے بسی سے اماں کو دیکھا۔ ”آپ تو جانتی ہیں وہ کتنا ضدی اور خود سر ہے۔ ہمیشہ اپنی ہی منوا تا آیا ہے“ وہ لا چاری سے بولیں تو اماں اسے دیکھ کر گرہ گئیں پھر ایک متا-سفا-نہ سانس بھر کر تنبیہ اٹھا کر اس کے دانے گھمائیں گئیں۔

”یہ سب تمہارے بے جالاؤ پیار کا نتیجہ ہے محض عمر کے مقابلے میں اسے زیادہ ناجائز اہمیت دینے کا انجام۔ مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ تمہاری عقل اب بھی پٹری سے اتری ہوئی ہے۔“ ماں سوچ کر گرہ گئیں بولی کچھ نہیں۔ ان کے اندر غم زدہ فضا میں سنسنے لگیں۔ وہ ہولے ہولے عمر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ جو یوں چپ لینا تھا گویا ان دونوں کے درمیان موجود ہی نہ ہو۔

وہ کیا سوچ رہا تھا، کن خیالوں میں گم تھا؟ انہیں علم نہ تھا مگر اتنا ضرور جانتی تھیں۔ کہ دشمن کی موجودگی میں اس کے اندر کھینچاؤ سا پیدا ہو جاتا تھا۔ چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی اور گہری خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی خوش نما آنکھوں کی تہوں میں برف سی کیفیت اتر آتی تھی۔ وہ یوں دکھائی دیتا جیسے برف کا آدمی ہو۔ مگر وہ جانتی تھیں اس برف کے اندر ایک آگ کا سلگتا آلاؤدہک رہا ہے۔ جو اسے اندر ہی اندر خاموش کر دے رہا ہے۔

”آ لے دو شہرہ کو۔ اب وہی اپنے بھائی کو سمجھائے گی اور اگر تیور کو نہیں سمجھا سکتی تو کم از کم اس باؤلے لڑکے کو ہی سمجھالے۔ میں تو عاجز آگئی دوںوں باپ بیٹے کی ضدی

طبیعت سے۔“ وہ دھجھلاہٹ سے بولیں اور دو پٹا سیٹھ گئیں۔ اس دم شہرہ کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا۔ تو اماں بھی چونک پڑیں۔

”ارے یہ تو شہرہ کی گاڑی کا ہارن ہے۔ بڑی عمر بنے ابھی ذکر کیا۔ ابھی آگئی۔“ جلدی سے دھاگے کروٹیا سیٹھ کر دوپٹے کے اندر ڈال کر دوپٹے کا گولا سا بنا کر ایک طرف رکھ دیا اور اٹھنے لگیں کہ شہرہ کتنی مسکراتی اندر داخل ہوئیں۔

”آداب امی جان۔“ گرے چکن کی شرٹ اور سفید چکن کی شلوار اور سفید دوپٹے میں وہ اس عمر میں بھی خاصی جاذب نظر دکھائی دے رہی تھیں۔

اماں بیٹی کی آمد پر خوش ہو گئی۔ انہیں احساس تک نہ ہوا کہ عرب شہرہ کو دیکھ کر تخت سے اتر کر باہر نکل گیا تھا۔

شہرہ نے سرسری نظر سے اس پر ڈالی تھیں۔ پھر اماں کے پاس بیٹھ کر اور ان کی خیریت دریافت کرنے لگی۔ جبکہ وہ لاؤنچ میں جانے کی غرض سے اس طرف آیا مگر درمیان نلتے پردے کے پار کھڑی عینیدے بری طرح ٹکرا گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے دھیانی میں بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اسکی بالکی چیخ پر اس نے پٹنار کر پردہ کھینچا تو وہ سر پکڑ کر کھڑی تھی۔

”غلطی تمہاری تھی۔“ اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ جلدی سے بولا۔ ”اس لئے کہتا ہوں ہمیشہ دیکھ کر چلا کرو۔“ وہ ایک طرف ہو کر اسے جانے کا راستہ دیتا ہوا بولا۔

”میں جانتی ہوں ہمیشہ غلطی میری ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے معافی بھی مجھے ہی مانگنا پڑتی ہے۔ آپ تو غلطی پر فہم ہیں۔ یوں بھی آپ جیسے انا پرست معافیاں مانگنے کی غلطیاں نہیں کرتے۔ چاہے قصور کبھی نکل آئے۔“ وہ زمین پر گرا شولڈ بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے بجڑے لہجے میں بولی تھی۔ ہزار شکوے سچ رہے تھے اس کے ایک جملے میں اور وہ کم فہم تو بہر حال نہیں تھا۔

اس کے چہرے پر پھل خنکی کے سبب سے اچھی طرح واقف تھا۔
 ”غلطی کو تسلیم کرنے کی عادت اچھی ہے بلکہ خوبی ہے مگر تسلیم کر لینے کے بعد
 آئندہ محتاط رہنا چاہئے کہ آدمی سے غلطی دوبارہ نہ ہو۔“ وہ اس پر ایک نگاہ ڈال کر آگے
 بڑھ گیا۔

وہ یونہی اپنی جگہ جی اس کے تصور پہنے پر لگتی رہی۔ اس شخص کے اندر شاید دل نام
 کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ کم از کم کل کے واقعہ پر زبان سے نہ کئی رویوں سے ہی سوری
 کر لیتا۔ وہ مزید یہاں چلے کر مٹنے کے لئے کھڑی نہ رہی ابھر وہ بے نیازی کے ساتھ لاؤنج
 کے صوفے پر بیٹھ کر کوئی میگزین اٹھا کر اس کے ورق گردانی کرنے لگا تھا۔ اور وہ دل ہی دل
 میں اسے کوئی ہوئی اماں جان کے کمرے میں چلی گئی جہاں مغل جم چکی تھی۔ فہم بھی آچکا
 تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا کر مسکرایا۔ وہ بھی مجھے دل کے ساتھ مسکرا کر اماں کے تخت پر چڑھ کر
 بیٹھ گئی۔



میں تیرے سنگ کیسے چلوں بنا
 تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا
 تو میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے چلے
 مہربانی تیری
 تیری آہٹ سے دل کا درپچہ کھلا
 میں دیوانی تیری
 میں دیوانی تیری
 تو غبار سفر میں خزاں کی صدا

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا
 ریڈیو کی آواز نے یکدم اس کے ذہن کو منتشر کیا تھا۔ فائل سے نگاہ اٹھا کر اس
 نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ یہ آواز لان کے راستے سے ادھر آ رہی تھی۔ اور اسے سمجھنے میں
 قطعی دیر نہ لگی کہ یہ حرکت سوائے اس سر پھری لڑکی کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جب
 سے آئی تھی سلسل اسے زچ کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اب اسے کمرے میں بھی
 سکون سے کام کرنے نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنے آگے رکھی فائل بیچ کر بند کی اور
 کھڑکی کی طرف آیا وہ سامنے کے چپوترے پر انتہائی اطمینان سے بیٹھی پاپ کارن کے
 ساتھ ایف ایم کے مزے بھی لوٹ رہی تھی۔

کھڑی کھلنے کی آواز پر وہ ذرا سا چہرہ موڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ پھر دوبارہ رخ
 موڑ کر شان بے نیازی سے پاپ کارن نکال نکال کر منہ میں ڈالے اور چباتے ہوئے ریڈیو
 کی آواز اور تیز کر دی۔

تو بہاروں کی خوشبو، گھٹی چھاؤں ہے
 میں ستارا تیرا
 زندگی کی ضمانت تیرا نام ہے
 تو سہارا میرا
 میں نے ساری خدائی میں تجھ کو چنا
 تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

اس نے غصے سے مٹھیاں سمجھ لیں۔ اسے سخت تاؤ آ رہا تھا اس کی ان ہچکات
 حرکتوں پر۔

یہ شاید کل کے تھپڑ کا جوابی بدلہ تھا جو وہ لے رہی تھی۔ اس نے وہیں سے اسے

ڈانٹا چاہا، پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کا خیال تھا اس کے سلگنے پر وہ اور لطف اندوز ہوگی۔ اس نے کھٹاک سے کھڑی بند کر دی اور پردہ مگر ادایا۔

تم چلو تو ستارے بھی چلنے لگے
آنسوؤں کی طرح
تم کو دیکھا تو آنکھوں میں چلنے لگے
آرزوؤں کی طرح

تیری منزل بنے میرا ہر راستہ
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

”تہیز، جنگلی، بیوقوف۔“ اس نے ساری فائلیں بند کیں انہیں دراز میں ڈالا اور

گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

خشن اور شرمہ اس مہارانی کی خاطر مدارت کے لئے پکن میں مصروف جانے کیا کچھ بنا رہی تھیں۔ پورا پکن بلکہ ڈانگ روم تک خوشبوؤں کی لپیٹ میں تھا۔ شرمہ اماں جان کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھی دنیا جہاں کی باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ باہر نکل گیا۔

کچھ دیر سڑکوں کی خاک چھانتا رہا پھر ایک دوست کے یہاں چلا گیا اس سے مگپ شپ لگانے کے بعد وہاں آیا۔ اس کا خیال تھا شرمہ بعد اس بلا کے جا چکی ہوں گی مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب وہ سب کھا۔ نہ کی میز پر ہی موجود تھیں اس کا مطلب تھا کہ بد قسمتی سے ڈرنج بھی آج لیٹ ہوا تھا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے عمر؟ آؤ کھانا کھا لو۔“ تیمور اسے دیکھ کر بولے۔

”میں کھا کر آیا ہوں پاپا۔“ اس نے زری سے جواب دیا بہر حال وہ خاصا فریٹ

ہو کر آیا تھا۔ ”ہاں اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔“

”کبھی ہمارے ساتھ بھی مل کر کھالیا کرو۔ دشمن تو نہیں ہیں ہم تمہارے۔“ خشن برا سامندہ بنا کر بولی۔

”صغریٰ بی بی عمر کو چائے بنا کر دے دو۔“ اماں جان نے صغریٰ کو آواز دیکر اسے ہدایت دی۔ پھر خشن پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔

”روز ہی تو ہمارے درمیان بیٹھ کر کھاتا ہے۔ ہمارے ہی ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ کبھی ہو جاتا ہے ایسا یا دروستوں میں مل کر کھالینا کوئی گناہ نہیں ہے۔“

وہ وہاں ٹھہرا ہی نہیں تھا کہ اپنے بارے میں کسی کے تہرے سنتا۔ شکوے شکایتیں سنتا۔ ٹی وی لاؤنج میں جاکر صوفے میں گھس کر ریوٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔ ریسٹنگ آر بی تھی اور اسکی تمام تر توجہ اسکی طرف منتقل ہو گئی۔

”اہل دل حضرات“ ذرے ذرے میں دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں اور پتھر دل انسانوں کو احساس کی دولت سے محروم ہونے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنا گ اٹھائے وہاں چلی آئی جس میں گرم گرم کافی تھی۔

عمر نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسکی طرف دیکھا تھا۔

”یہ بات کسی سیانے نے کہی ہے۔“ وہ اس کی اٹھتی نگاہ پر مسکرا کر بولی تو وہ آنکھوں میں تحیر بھر کر بولا۔

”کون سی بات؟“ پانچنیں اس نے واقعی اس کی بات نہیں سنی تھی یا انجان بن رہا تھا۔ بہر حال ظاہر تو کچھ یوں ہی کیا تھا۔ وہ بری طرح سلگتی تھی۔ اسے اس کا یہ انداز قطعی ڈراما بن لگا تھا۔

”کچھ نہیں؟“ آپ ریسٹنگ ہی دیکھئے۔“ وہ کسی کم سن ناراض بچے کی طرح منہ پھلا کر خود بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جب اس نے گہری سانس بھر کر ریوٹ سے ٹی وی

آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اس معصوم بچے کی طرح لگ رہی تھی جو روٹھ کر خنا چاہے جو رد کر ہنسنا چاہے۔ اسے بے اختیار ہی اس پر رحم آ گیا۔

”کسی بہت ہی اچھے سیانے نے یہ بھی تو کہا ہے کہ جل کر کباب ہونے سے بہتر ہے آدمی مکمل کر گلاب ہو جائے۔“ اس کا لہجہ دھما اور قدرے ملام تھا اس نے مسکرتے سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے سامنے میز پر دھرے کرشل کے نفیس سے گلدان کو گھورتے ہوئے بولی۔

”میرادل چاہتا ہے کہ آپ کے سر پر یہ گلدان اٹھا کر دے ماروں۔“ اس نے یوں کہا جیسے واقعی یہ اس کی شدید ترین خواہش ہو۔

”ارے ارے، مگر کیوں بھی؟“ وہ لہجے اور آنکھوں میں حیرت سموتے ہوئے بولا۔ مگر اسے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر یوں کی تراش میں پھیلی مسکراہٹ کو سینے ہوئے بولا۔

”اچھا بھی۔ بہر حال۔ گلدان اٹھا کر مارنے کی اجازت تو تمہیں نہیں دے سکتا اس خواہش کو تو تم رہنے ہی دو۔“

”ہاں واقعی کیونکہ یہ گلدان بہت قیمتی ہے اور اس کے ضائع ہونے کا مجھے بھی انفس ہوگا۔“ اس نے اس کی بات کا نٹے ہوئے کہا تھا اور عمر کا بے ساختہ قبضہ بکھر گیا۔

وہ ایک دم اس طرح چونک کر تھی جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔
یہ قبضہ خاصا گونگوار تھا۔ گویا وہ خاصے موڈ میں تھا اور وہ جل اٹھی یعنی کل کے واقعہ کا موصوف کو ملال تک نہیں۔

”میں اپنے کل کے رویے پر تادم بالکل نہیں ہوں۔“ وہ اس کے چہرے کو پھڑپھڑاتا تھا۔ اس نے کچھ جھینپ کر چہرے جھکا لیا تھا۔ ”بہر حال تم اگر ہرٹ ہوئی ہو تو مجھے دلی

انسوس ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے میز سے چائے کا گک اٹھالیا جو صغریٰ رکھ کر مٹی تھی۔ اور پھر اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر زیر لب مسکرانے لگا۔

”واقعی مجھے انفس ہے۔“ اور اس نے کچھ اور کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ شرہ یکدم ٹی وی لاؤنچ کے دروازے سے نمودار ہوئی تھیں۔ مگر وہیں رک کر عینہ کو گھورتے ہوئے بولیں۔

”تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ چلو اٹھو اور جانے کی تیاری کرو۔ باتیں ہی ختم نہیں ہوتی ہیں تمہاری۔ دو گھڑی اماں جان کے پاس نہیں بیٹھ سکتیں۔“ ان کے لہجے میں اس قدر ترشی اور تنقیدی تھی کہ عمر کو لگا جیسے وہ ساری کی ساری اس کے اندر اتر گئی ہوں، اور شاید وہ اتارنا بھی اس کے اندر چاہتی تھیں۔ وگرنہ وہ کب اپنی تازوں پٹی میں کو اس انداز سے مخاطب کرتی تھیں۔

”ممی! ابھی کچھ دیر تو بیٹھیں۔“ وہ جیسے جھل اٹھی۔
”فضول خند کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اٹھو فوراً۔“ شرہ کا لہجہ مزید بے لگ ہو گیا۔
”مردہ سنی ان سنی کرتی بیٹھی رہی۔“

شرہ کے تیور مزید بگڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ ماں بیٹی میں کھنچاؤ جاری رہتا عمر خود ہی لاؤنچ سے باہر آ گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اسے آں کیا اور کرسی پر گر گیا، اور اسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے کسی خیال کی احساس کی گرفت سے کلکانا چاہا ہو۔
ایک جھبن جو اس کے اندر ہو رہی تھی اس سے نجات چاہ رہا تھا۔



دلن بہت بے کیف سے گزر رہے تھے۔ اب پائینیں عینہ ہی کو لگ رہا تھا یا سب

محسوس کر رہے تھے۔ کئی دنوں سے اس نے "تیورولا" کی طرف چکر نہیں لگایا تھا۔ اس کا وہاں بھاگ بھاگ کر جانا ایک تو ثمرہ کو پسند نہیں تھا۔ دوسرے جس کے لئے جاتی تھی وہ اسے لائق توجہ نہیں سمجھتا تھا اس کی بے دریغی اکثر اس کا دل توڑ ڈالتی۔

"امی یہ عمر بھائی مجھے اتنے اچھے کیوں لگتے ہیں۔" ایک روز وہ ثمرہ عمر کے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھی تھی اور باتیں نانو کے گھر کی ہو رہی تھیں۔ تیورامون ٹمن ممانی، پھر اچانک وہ عمر کا ذکر لے آئی۔

ثمرہ آئرن اسٹینڈ کے پاس کھڑی اپنی قمیص پر استری پھیرتے پھیرتے یکدم ٹھنکری گئی۔ اعصاب پر خفیف چھکا لگا تھا۔ پھر رخ پھیر کر اسکی طرف دیکھا مگر وہ بیڈ کے سائیز پر رکے لپ کے بہن کو کھول اور مندر کر رہی تھی۔ اسکا چہرہ جھکا ہوا تھا اور کئی لمبیں چہرے پر جمول رہی تھیں۔

"نزن ہے تمہارا" اس میں انہونی سی کون سی بات ہے۔" وہ سنبل کر ناگواری چپا کر عام سے لہجہ میں بولیں۔

"نزن تو میرے فہد بھائی بھی ہیں۔ اور ابی (پو پھو) کے وجاہت بھائی بھی ہیں۔ نعمان چچا کے نیل اور عقل بھی ہیں مگر جو بات عمر بھائی میں ہے وہ کسی میں نہیں یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا ہوگا۔ کہیں میں لوہے کا ٹکڑا اور وہ مقناطیس تو نہیں ہیں کہ میں انہیں دیکھتے ہی۔"

"شٹ اپ یعنی۔ کیا فضول بکواس کر رہی ہو۔"

وہ جیسے مجلس کر چلی تو اس نے گھبرا کر منہ میں انگلی دبا لی۔ جیسے واقعی کوئی غلط بات منہ سے نکال دی ہو۔

"یہ سب تمہاری بچکانہ سوچ ہے۔ اس شخص میں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں

ہے۔ کوئی سٹارٹر کرنے والی خوبی نہیں ہے۔ عام سالک انتہائی عام سے شخص ہے۔" وہ چند لمبے وقف کے بعد بولیں تو لہجہ میں شعلے چل رہے تھے۔

عینہ کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔

"امی، یہ تو یاد داتی ہے ایسا تو نہ کہیں۔ اتنے پرکشش ہیں اس قدر شاندار اور چارمگ پرستلی ہے ان کی کہ۔"

"بھئی۔" انہوں نے استری کا پلگ نکال کر اسٹینڈ پر بٹھا اور بیگر کیا سوٹ اٹھا کر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے اسے گھورا۔

"جاؤ مائی آگئی ہوں گی۔ اسے مشین کھول دو۔ ڈھیر سارے کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔ کل بھی چھپی کر لی تھی اس نے میں تم سے کہہ رہی ہوں بھئی۔ اٹھو اور اس کے بعد اپنی بکس نکال کر پڑھنے بیٹھو۔ امتحانات سر پر ہیں اور تمہیں فضول باتوں کی پڑی ہے۔ خبردار جو اماں جان کی طرف گئیں انگرام سے پہلے۔"

گوکہ انہوں نے دھمکی تو دے دی تھی مگر وہ جانتی تھیں وہ وہاں ضرور جائے گی۔ ایک تو کالج سے گھر بالکل نزدیک تھا۔ اور دوسرے.....

اس سے آگے سوچ کر ان کا دماغ جھلنے لگا تھا۔ اس کے مردہ قدموں سے کمرے سے نکل جانے کے بعد وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کپٹیوں میں ایک کچھیا ڈسما محسوس ہونے لگا تھا۔

عینہ نے ان کے خدشوں کی کبھی راکھ کو کرید دیا تھا۔ ان کے واہموں کی دلی چنگاریوں کو ہوا دے ڈالی تھی وہ کم فہم یا کم سن تو نہیں تھیں کہ اس کے جذوبوں کو پہچان نہ پائیں اس کا بھاگ بھاگ کر تیورولا ولا جانا۔ سارا سارا دن عمر کے کمرے میں گھسے رہتا۔ اس کے گرد طواف کرتا۔ اس کی غیر موجودگی میں لان میں ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کرتا۔ پھر

اسے دن بھر کی روداد سنانا، آخر فہمیدی تو تھا اس گھر میں۔ بلکہ یہاں بھی آتا رہتا تھا مگر وہ تو اسے کبھی نظری نہیں آتا تھا۔

وہ جتنا سوچتی گئیں ان کے دماغ میں اتنے ہی خدشے اور خوف سراٹھا اٹھا کر انہیں اذیت دیتے رہے۔ تھک کر آنکھیں موند کر اس اذیت آمیز سوچ سے نجات پانے کی سعی کرنے لگیں۔



جلتی شمعیں ، روشن چہرے
کامنی لڑیاں ، نازک سہرے
زگرس بیلا ، موتیا ، لالہ
جوہی چمپا اور بنفشہ
ہر کوئی یارو شاد ہے نا
آج تمہاری سالگرہ ہے
دیکھو ہم کو یاد تو ہے ، نا

وہ خوبصورت سے کارڈ اور اس پر رکھے ایک گلاب کے پھول کو دیکھ رہا تھا۔ جو عین یہ کالج جانے سے پہلے ادھر آ کر اس کے ہیڈ کارڈ پر رکھ گئی تھی۔ وہ غالباً اس وقت آئی تھی جب وہ کمرے میں نہیں تھا۔ کارڈ کے اندر نظم لکھی تھی جو خاص طویل تھی۔ اس نے پوری نہیں پڑھا۔

اس کے لبوں پر گردش کرتی مدہمی مسکراہٹ یہ سوچ اور پھیل گئی کہ وہ اٹھارہ انیس سالہ نازک سوچوں کی مالک لڑکی دل کی واقعی اچھی تھی باوجود شرمہ کی بیٹی ہونے کے وہ اسے عزیز تھی۔ وہ ابھی کارڈ دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”نہیں، کم آن دروازہ کھلا ہے۔“ اس نے کارڈ اور پھول ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف پلٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اندر داخل ہونے والی شرمہ جیسے سفید کلف لگا دو پیاسر پر جمائے وہ خاصی چھٹی نظروں سے اسے دیکھ کر اندر آ گئیں۔ پھر خود ہی بولیں۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”جی..... جی ضرور۔“ وہ لگنے والے اس خفیف سے جھٹکے سے جلد ہی سنبھل کر اخلاق سے بولا۔ پھر منتظر رہا کہ وہ خود ہی اپنے آنے کی وجہ بیان کریں۔ مگر جب وہ بولیں تو اس کے اعصاب کے پر نچے اڑا دیئے۔ اسے گویا شعلوں میں دھکیل دیا۔

”عمر میری بچی عینہ بہت چھوٹی اور معصوم ہے اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہے ابھی۔ وہ ابھی لفظوں سے بہل جانے والی عمر میں ہے۔ اس عمر میں بھڑکنی آگ بھی چمکتی کوئی خوش نمائش دکھائی دیتی ہے جسے چھونے کی خواہش چل جاتی ہے۔ مگر وہ آپ کو چھونے کے بعد کی تباہ کاریوں سے بے خبر ہوتی ہے۔ جل جانے اور جھلس جانے کے احساس اور خوف سے بے نیاز ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ذرا سا مسکرائیں۔ بڑی استہزائیہ آمیز مسکراہٹ تھی مگر دوسرے لب لبوں کو چھپتے ہوئے بولیں بلکہ پھٹکاریں۔

”اور تم ایک سمجھ دار، پیچورڈ انسان ہو اس کے ارد گرد یہ آگ دہکا کر اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تم سے اس کی یہ قوتی دلچسپی ہے۔ تم سے کوئی دائمی اور انٹ رشتے میں نہیں بدل سکو گے۔“

”آ۔ آپ۔“ وہ اس شدید قسم کے ذہنی دھچکے سے پوری طرح نہ نکل سکا اور کچھ لہنا چاہا کہ وہ جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے اسی لب و لہجہ میں بولیں۔

”مجھے تم سے صرف یہی کہنا ہے کہ تم اس سے دور رہو۔ اس کی اس معصوم عمر کو اپنے

فریب میں بکڑنے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں کامیابی نہیں ہوگی۔“ ان کی آنکھوں کی تہ میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور یہ ساری کی ساری وہ عمر کے وجود میں اتار کر کمرے سے نکل گئیں۔ جبکہ کمرے میں سلگتے احساس کے ساتھ کھڑے رہ جانے والے عمر کو لگا جیسے کمرے کی چھت اس پر آگری ہو۔ اور وہ پورا پورا اس کے لمبے تلے دب کر رہ گیا ہو۔

اپنی پھوپھی کے اس قدر پستی میں اتر جانے کا تو تصور بھی نہیں تھا اس کے پاس۔

کتنی دیر تو وہ بے یقین رہا کہ کوئی اتنا گھٹیا الزام اس قدر رک جلد بھی اس کی ذات پر کر سکتا ہے۔

دوسرے پل اس کی رگوں میں خون کی جلد آتش سیال دوڑنے لگا۔ اسے اپنا پورا وجود کھولتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ رگ رگ سے چنگاریاں پھوٹی محسوس ہوئیں۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اور ایک جھٹکے سے نیم وادروازہ کھول دیا۔ مگر پھر کسی احساس نے اس کے قدم بکڑ لئے وہ دروازے کے فریم پر مضبوطی سے انگلیاں جما کر اپنے اندر سے اٹھنے والے غصے کے ابال کود بانے لگا۔

موجودہ حالات مبین روز و شب گزارتے ہوئے گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ آنے والے کسی لمحے میں اس کی ذات کو کوئی ایسی غلاظت بھری گالی سے گندا کر دے گا۔

اور، اور کس قدر رنج اور افسوس کی بات تھی کہ یہ سب شمرہ نے کیا تھا۔

کیا اس کا اپنا منہ ایسی گندی گالی دیتے ہوئے گندا نہیں ہوا تھا؟

کیا ان کی بیٹی پر چھینے نہیں آئے تھے۔

ایسی ناقابل تلافی اذیت وہ دے گئی تھیں۔ اس کے ذہن میں تو ایسی دشمنی کہیں

بھی رقم نہیں تھی جو اس کی اپنی پھوپھی سے ہوئی ہو۔

اس نے کمرے کا دروازہ غصے سے لات سے بند کر دیا پھر شرٹ اتار لی اور سیدھا واش روم میں چلا گیا۔ کتنی دیر شاہد لیتے رہنے کے باوجود اندر کی آگ کم نہ ہوئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب حیرت غصے اور بے یقینی کی جگہ تاقت دکھا اور رنج نے لے لی تھی۔

وہ آفس جانے کی بجائے سارا دن گاڑی لیے راستوں کی خاک چھانتا رہا۔ گھر آ کر رات بھر سگریٹ پھونکتے ہوئے اس واقعہ کی بد مزگی اور اذیت کو محسوس کرتا رہا۔

بہت کڑھئے، اذیت برداشت کر کے کے بعد وہ کوئی آدھی رات کو اپنی کھڑکی کی سلائیڈ کھولنے لگا ان کے اندر جیسے کو گھورتے ہوئے اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔

رگوں میں دوڑتی آگ کی پیش کش کم ہو گئی تھی۔ مگر دل میں اب نفرت آمیز جذبہ سر اٹھارہا تھا۔

آپ نے اچھا نہیں کیا شمرہ پھوپھو۔ بہت برا کیا ہے۔“ اس کے لبوں کی تراش میں زہریلی مسکراہٹ نکھر گئی۔ اس ریک بے بنیاد الزام کی اذیت کا احساس کوئی پوشاک نہیں تھی جیسے وہ اتار دیتا۔ یہ تو اس کے قسم اور خون میں اتر گئی تھی۔ اس کے کھال سے لپٹ گئی تھی۔

اس نے خود کو کرسی پر گرالیا اور سگریٹ کے مرغولے میں نگاہیں گاڑتے ہوئے سوچتا رہا۔

”مگر آپ کی ناز و بی بی جی کی عرواقی فریب میں آ جانے کی ہے تو میں اسے واقعی فریب میں بکڑوں گا اور کامیاب ہو کر دکھاؤں گا۔ میں اس کی وقتی دلچسپی کو دائمی محبت میں بدل دوں گا۔ آپ شاید ایک مرد کو رہنے کے باوجود مرد کی کئی پرتوں سے بے خبر ہیں۔ اب میں آپ کو یہ آگئی دوں گا کہ مرد وہی نہیں ہوتا جو دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ اور اب وہ آپ کو نظر آئے گا۔“ اس نے انگلی کو چھو جائیو الی را کھ کوا لیش

ٹرے میں جھاڑا پھر آدھی سے زیادہ سگریٹ بھی ایٹش ٹرے میں دبا کر مسل دی۔ مسئلے ہوئے خود بخود اس کی انگلیوں میں کڑکھٹی آگئی تھی۔



وہ کالج گیسٹ سے نکل کر لڑکیوں کے جھوم کو چرتی کالج وین کی طرف بڑھنے لگی کہ ایک کار کا زور دار ہارن اس کو رکنے پر مجبور کر گیا جیسے کسی نے ہارن کے بل بوتے پر اسے متوجہ کرنا چاہا ہو۔ وہ رجنر کا ہتھ بٹائے بنائے پلٹی تو عمر کو کچھ کر حیرت کا شکار ہو گئی۔ انہوں نے جو ہوئی تھی پھر حیرت سمیٹ کر فرنٹ ڈور کی طرف آئی اور شیشے میں سر ڈال کر اسے دیکھتے ہوئے حیرانگی ظاہر کئے بناندر ہو سکی۔

”آپ۔ یہاں۔ خیریت؟“

”آؤ بیٹھو۔ خیریت ہی ہے۔“ وہ آنکھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر بولا۔ اس کے بیٹھے ہی امپشن میں لٹکی چابی کو جھٹکے سے گھما دیا۔ دوسرے بل گاڑی بتے پانی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی۔

کئی لمحے گاڑی کی فضا میں سکوت ہی رہا۔ وہ گاہے بگاہے اس پر حیرت آمیز نظر ڈال کر بے چینی سے اپنے بیگ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ اس کے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دیا۔ پھر اس کی طرف ذرا سا چہ موز کر بولا۔

”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ اب اتنا تو حق بتا ہے نا تمہارا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں کی ترش میں پھیلی مسکراہٹ کشادہ ہو گئی۔ گاڑی کچھ دیر بعد ایک ریستوران کے سامنے روک دی اور دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

”تم نے میری برتھ ڈے کو یاد رکھا۔ مجھے ”وش“ کیا۔ کیا میں جواب میں اتنا بھی

وہ تو فوت ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ آیا یہ وہی عمر تیرور ہے یا کوئی اس کا ماسک چڑھا کر چلا آیا ہے کہاں وہ اکھڑا، اور اسے خاطر میں نہ لانے والا کہاں یہ! اتنا مہذب نازک احساسات کی پذیرائی کرنے والا۔

یا پھر یہ کوئی بے حد خوش نما خواب ہے۔

مگر یہ خواب بھی نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ اس کے ارد گرد بکھری ہوئی تھی وہ اس غیر متوقع صورتحال پر کسی طرح فوری رد عمل ظاہر کرنے کے قابل ہی نہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے عقل تو دیے بھی تمہارے پاس کم ہے اور بھوک میں تو رہی یہی بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہوگی۔ چلو آؤ۔“ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ اور یکدم اسے بھی اپنے انتہائی کم عقل بے وقوف ہونے کا احساس ہوا تو سرعت سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

”میں کچھ چوسکتی ہوں کہ آپ کم ہیں یہ انقلاب کیسے آیا؟“ کئی لمحے کی خاموشی اور بے چینی کے بعد وہ آخر کار اپنی حیرت کے اظہار سے خود کو باز نہ رکھ سکی تھی۔

اس نے ویز کو اپنی پسند کے کھانے کا آرڈر دیکر مینو چارٹ بند کر کے اسے واپس پکارتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب کیا انقلاب؟“

وہ سر جھکا گئی۔ اور میز کے کنارے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے دھیرے سے

بولی۔

”وش تو میں آپ کو پچھلے دو سالوں سے کر رہی ہوں آپ کی برتھ ڈے پر۔ مگر۔“

اس نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی انتہا کم سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر اس

اس نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی انتہا کم سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ لحد بھر اس کے چہرے پر ایک مضطر بانہ بکا رنگ آ کر گزر گیا پھر کھڑکی کی سانس بھر کر کرسی کی پشت سے الگ کر اسے بے حد نرم لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے ذرا سانس دیا۔

”تمہیں یہ انقلاب پسند نہیں آیا؟“

اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ بس سراٹھا کر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

ویر مستعدی سے لوازمات سجا کر چلا گیا۔

”عینیہ! میرا خیال ہے محبت بلکہ بے غرض محبت ایک عجیب ہی ناک ہے۔ یہ

ہماری ساری دشتوں کو چوس لیتی ہے۔ ہماری روح کو ہلکا ہلکا پرست کر دیتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے روح میں اتر جانے والی نگاہوں سے اس کے معصوم خوش نما چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

چاول کے تجھے پر عینیہ کی انگلیاں جانے کیوں کانپ سی گئیں۔ اس کی نگاہوں میں ایسا کچھ تھا یا لہجے میں یا پھر جملے نے ہی اسے اندر باہر سے بے ترتیب کر ڈالا۔

میز پر چند لمحے سکوت طاری رہا۔ عمر اسی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یکدم ہی خاص طوفان برپا ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ سر جھکا کر کتاب اٹھا کر اس پر ہلکی آواز سے مگر پورے دباؤ سے کاٹنا مارنے لگا۔ پھر جیسے اندر باہر کے سکوت سے گھبرا کر بولا۔

”تم آتم کی تم کو کب سے ہو گئی ہو عینیہ۔“

وہ سراٹھا کر صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”کیا واقعی تمہارے لئے میری بات بڑا شاک یا بڑی حیرت ثابت ہوئی ہے۔“

وہ اب خود حیرت سے استفسار کرنے لگا پھر خود ہی سر جھٹک کر بولا۔ ”حالا کم میں اتنا روڈ۔“

اتنا ریزہ اور اس حد تک تم سے دور تو نہیں تھا۔ ہاں شاید۔ جس سے انسان بے حد قریب ہوتا ہے وہی فاصلے پر نظر آتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ پھر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

وہ تو بے درپے حیرت کے جھکوں سے لنگ سی ہو کر رہ گئی تھی اسے تواب یہ چاول بھی منہ میں ڈال کر چپانا مشکل ہو رہا تھا۔ دھت کے پانی جیسی سیال شے بھی اسے اپنے حلق میں پھنستی سی محسوس ہوئی۔

چپائیں رستوران کے خوبیاں ماحول کا اثر تھا یا اس کی نگاہوں کا یا جملوں کا یا پھر اپنے ہی دل کی دشت کا وہ ایک دم ہی وحشی برہنی کی طرح کھڑی ہو گئی۔

”ارے کیا ہوا؟“

”بس۔ بھوک نہیں لگ رہی۔ یوں بھی میں نے کالج میں برگر کھا لیا تھا۔“

اسے اپنے جسم کے مساموں سے مینہ پھونٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ یہ دشت اس کے چہرے پر سرخی بن کر عمر کو دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک دو لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر۔ سر ہلا کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

”چلو جیسی تمہاری مرضی۔ مگر لڑکی اتنا بہت کچھ ضائع کر ڈالا۔ کم از کم مجھے ہی کچھ کھانے دیتیں۔ میں نے قطعی کوئی برگر نہیں کھایا۔“

وہ شرمندہ ہو گئی۔ مگر اب اس شخص کے سامنے اسے بیٹھنا دو بھر لگ رہا تھا۔ وہ ندامت کے باوجود وہاں نہ رکی اور تیز تیز قدم اٹھا کر گلاس ڈور کھول کر کھلی فضا میں نکل آئی۔ باہر آ کر اسے اپنے تپتے زخموں پر ہوا خنک خنک سی محسوس ہوئی۔ یوں جیسے جلنے شعلوں پر شبنم کے چھیننے پڑے ہوں۔

واپسی کا راستہ بے حد خاموشی سے طے ہوا۔ وہ اسے گھر کے سامنے اتار کر درش

انداز میں گاڑی بھگالے گیا تھا۔ اور وہ دروازے پر کھڑی ٹائروں کے احتیاج سے اڑنے والی دھول کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

”میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی میری زندگی میں ایسے قیمتی اتنے حسین لمحات بھی آئیں گے۔“ وہ گہری سانس بھر کر سرشاری کے عالم میں اندر چلی آئی۔



پورا دن اس نے ایک سینکڑے احساس کے ساتھ گزارا مگر کیا یہ اتفاقات اسے رہ کر حیرت۔ خوشگوار حیرت میں مبتلا کرتا رہا۔ اس کا دل چاہا وہ اپنی اس خوشی میں کسی کو شریک کرے۔ مگر کسے؟

اس کی تو کوئی بہن بھی نہیں تھی۔ یکدم خیالِ امین کی طرف گیا۔ اس نے جھٹ سے امین علوی کا فون ملایا دوسری سمت وہی تھی۔ اس کی آواز سن کر چپکلی۔

یا سماعت کا بھرم ہے یا کسی نغے کی گونج

ایک پہچانی ہوئی آواز آتی ہے مجھے

”ایمنی کی بچی! کیا صبح و شام شاعری کا متیج کھاتی ہے۔“ وہ چلائی تو وہ کھل کھلا

پڑی۔

”کہ کیسے یاد کر لیا کیا کام پڑ گیا مجھ غریب سے؟“

ویسے ابھی ہم دونوں کو بچھڑے زیادہ گھٹنے بھی نہیں گزرے۔ ہاں دیکھو جزل و رزل مت مانگنا چونکہ ابھی تمہیں نہیں دینے کا بہت کام باقی ہے“

ہاں دیکھو جزل و رزل مت مانگنا چونکہ بہت کام باقی ہے“

”کوئی مارو جزل کو۔ آج تو میں تمہیں زندگی میں ملنے والی سب سے بڑی خوشی کی

بات بتانے والی ہوں بولو سنو گی؟“

”ایسی خوش خبریاں سننے کو تو کان ترس گئے ہیں۔ اب بھی پوچھ رہی ہوں سوگی۔ بے وقوف لڑکی فوراً ناسودہ“ اس کی بات پر وہ کہنے لگی۔ پھر کچھ لمحے توقف کے بعد ٹھہر ٹھہر کر سارا واقعہ گوش گزار کر دیا۔

”اے“ ہوئے۔“ امین نے اس کے چپ ہونے پر زور سے سیٹی بجائی کہ وہ خواہ مخواہ میں بلش ہو کر رہ گئی۔ یہ بھی اچھا تھا وہ بد تیز لڑکی سامنے نہیں تھی۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ

زندگی ڈوب گئی ان کی حسین آنکھوں میں

وہ میرے پیار بھرے افسانے کو انجام ملا

اس نے مارے شرم اور غصے کے ریسپورنٹ دیا۔ پھر بے اختیار کھل کھلا پڑی۔ اور ریسپورنٹ کو گھورنے لگی۔ اسے پکا یقین تھا وہ اس کا ترمز اہل کر رہی ہوگی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے پل کھنسی بج اٹھی۔ ریسپورنٹ اٹھاتے ہی وہ زور سے چلائی۔

”ایمن اگر۔ اگر اب تو انسانیت کے جامے میں نہیں آئی نا تو بس میں بات نہیں کروں گی۔“

”مسئلہ یہ ہے خاتون کہ انسانیت کے جامے ملنے کہاں ہیں ذرا پتا بتا دیں۔ میں خرید لوں گا۔“ دوسری طرف امین کی بجائے فہد کی آواز سن کر اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

”اوہ۔ سوری میں سمجھی امین ہوگی۔ میری فرینڈ۔“

”یعنی اس کے حصے کی پھینک مار میں نے کھالی۔ چلو اس کی بچت ہوگئی۔“ وہ ہنسنا تو وہ

جھینپ گئی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اور کیسے ہیں آپ؟ نا تو کیسی ہیں اور؟“

”تمہاری دعا سے سب عافیت میں ہیں۔ بس خیر نہیں ہے تو میری نہیں ہے۔ اجی

وے پھوپھو کہاں ہیں آج انہوں نے بخدا صراحت مجھے رات کے کھانے پر بلوایا ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ پائے بناؤں گی تم ضرور آنا۔“
وہ حیران رہ گئی۔

”اچھا۔ مگر میرے علم میں تو یہ بات نہیں ہے۔ صرف آپ کو ہی انویٹ کیا ہے۔ یا۔ کسی اور کو بھی؟“ وہ عمر کے بارے میں پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔

”باقی کا تو مجھے علم نہیں ہے بس اپنی خبر ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ اور جانے کیوں اس کے اندر تیرا سا اثر گیا۔ اسے ہمیشہ امی سے یہی شکایت رہی تھی کہ وہ نانو کے گھر میں فہد کو ہی اہمیت دیتی تھیں۔ پتا نہیں فہد سے انہیں اتنا قلبی لگاؤ کیوں تھا۔ حالانکہ عمر بھی ان کا ہی بھتیجا تھا۔ ان کا خون تھا۔ ان کے چہیتے بھائی کی اولاد تھا۔

”یاری میں تم ماں بیٹی میرے لئے اتنا نہیں کر سکتیں کہ پاپا کو میرے باہر جانے کے لئے راضی کر لو۔ صرف دو سال کی تو بات ہے۔ یا کون سا میں عمر مجھرو ہیں چپک جانے کو کہہ رہا ہوں۔“ وہ اپنے مطلب پر آ گیا۔ عینید گہری سانس بھر کر مسکرائی گئی۔ ”سنا ہے بلکہ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ دیار غیر جانے والے چپک ہی جاتے ہیں۔ پتا نہیں کون سا سلوٹن لگا کر جاتے ہیں۔“

”مگر میں بانی گاڈ کوئی سلوٹن لگا کر نہیں جاؤں گا۔ تاریخ کو ہرگز نہیں دہراؤں گا پلینز یاڈ ہیملپ می عینی۔ ثمرہ پھوپھو اور بد قسمتی سے تمہاری بات پاپا مانا لیتے ہیں۔“ وہ التجا پر اتر آیا۔ وہ ششپا گئی۔

”سوری فہد بھائی اس معاملے میں وہ میری ماننا تو دور کی بات سننا بھی شاید گوارا نہیں کریں، اور پھر نانو بھی تو نہیں چاہتیں۔ آپ.....“ اس نے یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ ثمرہ کھڑی تھیں اور بنور اس کی گفتگو سن کر کھوج میں تھیں کہ وہ کس سے محو

گفتگو ہے۔ وہ فوراً جان چھڑانے کو بولی۔

”چلیں۔ آپ ایسا کریں۔ ماما سے بات کریں ہو سکتا ہے وہ اس معاملے میں کوئی مدد کر سکیں۔“ اس نے کہا تو وہ بولا۔

”ہاں، دو پھوپھو کو ہی دو۔ تم سے تو کوئی امید رکھنا ہی بے کار ہے تم وادی کا دوسرا روپ ہو۔“ وہ شاید جھنجھلا گیا تھا۔ وہ ہنسے لگی اور ثمرہ کی طرف ریسور بڑھا دیا۔

لیجئے۔ آپ کے چہیتے بھتیجے کا فون ہے۔ بات کیجئے۔“ اس کے اس طرح کہنے پر ثمرہ نے آگے بڑھ کر ریسور اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ذرا گھور کر اسے دیکھا تھا اور پھر سارے جہاں کی محاسن لہجے میں بھر کر فہد سے باتیں کرنے لگیں۔ جبکہ عینید وہاں سے نکل کر لاؤنج میں چلی آئی اور صوفے میں جھنس کر کٹشنگ گود میں دبا کر ایک دفتریب احساس میں گم ہو گئی۔

زندگی ڈوب گئی ان کی حسین آنکھوں میں

وہ میرے پیار بھرے افسانے کو انجام ملا

ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا

دل یہ سمجھا کہ پھلکتا ہوا اک جام ملا

ایمن کی شرارتیں یاد آنے لگیں اور ذہن پر خوب صورت یادوں کی برسات ہونے لگی۔



کئی دنوں بعد وہ تیمور والا آئی تو اماں اس سے اتنے دنوں کی غیر حاضری کی شکایت کرنے لگیں۔

کیا کروں نانو۔ امتحانات سر پر ہیں۔ سارا سارا دن کتابوں میں سرکھپاتے گزر

لگ رہا تھا سفید شیٹ پر ادھر ادھر رنگ بکھرے ہوئے ہوں اس نے سوچا پتا نہیں ان بکھرے رتوں میں کوئی واضح تصویر کس طرح جھلکے گی۔ انہیں کیسے تصویر کا روپ دیں گے۔

پھر سر جھکا۔

یہ خالص ان کا درد تھا۔ اسے کیا، وہ تصویر چھوڑ کر اس کی جیتی جاگتی شخصیت کو دیکھنے لگی۔ پھر دھیرے سے خود ہی بولی۔

”کیسے ہی آپ؟“

”بالکل ٹھیک، تم سناؤ۔ اسٹڈی ہو رہی ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے میں تاریخ سے تمہارا پہلا پیپر ہے۔“ اس کی اس معلومات پر وہ پہلے تو حیران ہوئی پھر دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کے معاملے میں اتنی دلچسپی لیتا تھا۔ وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کمرے میں چہرہ پر نگاہیں دوڑانے لگی۔

”پہلا پیپر کس بجلیٹ کا ہے؟“ وہ ہنوز تیزی سے برش سے رنگ بھیرتے ہوئے اسے ہم کلام بھی تھا۔

”اس کا کس۔“

”اچھا چلو ایڑی ہے۔“

”کہاں۔ آپ کے لئے ہوگا۔ اتنا مشکل لگتا ہے مجھے تو۔“ وہ منہ بنا کر بولی تو وہ راسا چونکا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

”دنیا میں کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ اچھا ذرا یہ نیلی ٹیوب اٹھا کر دینا۔“ وہ اپنی تصویر پر تنقیدی نظریں ڈالے ہوئے بولا۔ وہ شاید اس میں کوئی فالٹ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے ذرا فاصلے پر رکھی میز سے نیلی لکری ٹیوب اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی اور اسے متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ لیجئے۔“

جاتا ہے۔“ وہ ان سے لپٹ کر صاف جھوٹ بول گئی اور اپنے جھوٹ پر اندر ہی اندر ہنس پڑی۔ (آپ کے پوتے کو پڑھ رہی ہوں نا تو سارا سارا دن اور ساری ساری رات) دل میں اس نے سوچا۔

”ہاں تمہارے تو ایگزام بھی اب ہونے والے ہیں۔ ایسے وقت تو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔“ شمن چائے کی فرامی لیے ادھر ہی آ گئیں۔ ”فندے کے ایگزام ہوتے تو دروازہ اندر سے لاک کر کے رکھ لیتا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ میں کہوں لڑکے کم از کم دروازے کو لاک تو مت کیا کرو۔ میں کھانا تو رکھ جایا کروں تو پتا ہے کیا کہتا ہے۔ امی جان! اسی لئے تو لاک لگائے رکھتا ہوں۔ آپ بار بار مٹا کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے ڈسٹرب کرنے چلی آتی ہیں۔ کبھی دودھ لینے کبھی جوس تو کبھی پڈنگ کبھی کچھ۔“ وہ چائے اس کے آگے رکھتے ہوئے بولیں تو وہ ہنس پڑی۔

”صغریٰ! ذرا یہ چائے عمر کو دے آؤ۔“ انہوں نے ایک کپ اماں جان کے آگے رکھا اور دوسرا اٹھا کر ملازمہ کو آواز دینے لگیں تو وہ جلدی سے بولیں۔

”لائیں، میں دے آتی ہوں۔ یوں بھی مجھے عمر بھائی سے کام بھی ہے۔“ اس نے جلدی سے شمن کے ہاتھ پر ہلکا سا تھام لیا اور کھڑی ہو گئی۔ شمن نے بس ایک دو لمحے اس کی طرف دیکھا۔ بولیں کچھ نہیں پھر سر ہلا کر اپنا منگ بھرنے لگیں اور وہ ان کی اتنی نظروں سے بے نیاز سرعت سے لاؤنچ سے نکل کر عمر کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اپنے بیزروم سے ملحقہ کمرے میں اپنی ادھوری پینٹنگ پوری کرنے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر ذرا سا چہرہ موڑا تھا اور رخت پھر کر چلتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

”یہ آپ کی چائے۔“ اس نے مگر ریک پر ہی رکھ دیا اور خود بھی وہیں کھڑی ہو کر ایزل پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگی مگر کچھ پلے نہ پڑی۔ عجیب الجھی الجھی تصویر تھی۔ یوں

وہ پلٹا نہیں اور یونہی رخ موڑے موڑے ہاتھ بڑھا کر ٹیوب لینی چاہی مگر بالکل اچانک ٹیوب کی بجائے اس کا نرم ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔
پتا نہیں یہ دانستہ ہوا تھا یا نادانستہ۔

عینہ کے توپورے بدن میں سینا ہٹ سی دوڑ گئی۔
اس کے ہاتھ کے لمس نے اس کے اندر کھلی سی بھری۔
اسے اپنا پورا جسم دل کی طرح دھڑکنے محسوس ہونے لگا۔

وہ شاید بے خبر تھا۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا پھر جیسے انتہائی مصروفیت کے عالم میں وہ بیان نہ دے سکا اور ہاتھ سے گرفت ہٹا کر وہ ٹیوب تھام لی اور اسے پلیٹ میں نکال کر گھولنے لگا۔

”مشکل کوئی سبب تک اس وقت لگتا ہے لڑکی۔ جب تیاری مکمل نہ ہو۔ وہ سر کے اوپر سے گزرا کر گیا۔ دل جسمی سے پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ ابھی سینڈائیر میں ہی اتنی مشکل پڑ رہی ہے تو تیری کام کیسے کر دگی۔“ وہ برش سے رنگ کس کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ جبکہ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ کر اس کے بیڈ کے کنارے جا کر بیٹھ گئی تھی اور دل کی حالت معمول پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔ اور بیٹھے بیٹھے بس سر اٹھا کر اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

وہ اس پر آگ کے چھینٹے پھینک گیا تھا اور کیسا بے خبر تھا۔ اس نے ایک گہری سانس بھری اور جلدی سے سر جھکا لیا۔ وہ رنگ اور برش ٹیبل پر رکھ کر چائے کا مگ اٹھا کر پلٹا تھا اور پھر قریبی اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اتنی چھوٹی سی اسٹول پر اتنا لمبا چوڑا شخص عجیب سا لگ رہا تھا۔

وہ اس پر نگاہیں ڈال کر پھر بلا وجہ اس کے بیڈ کے سائیز پر رکھے لائٹ کو اٹھا کر اسے کھولنے اور بند کرنے لگی۔

”میں کوئی بی کام نہیں کر رہی ہوں۔ لی اے کروں گی۔ مجھے اکتانکس سے بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے لائٹ رکھٹ کیا۔ ہلکا سا شعلہ اچھلا اور معدوم ہو گیا۔ پھر رکھٹ کیا۔ شعلہ اچھلا مگر جلتا رہا اور وہ اس شعلے کو دیکھنے لگی۔ تب اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے لائٹ چھیننا چاہا تو وہ فوراً متوجہ ہو گئی اور جھکے سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔
”آگ سے کیوں کھیل رہی ہو بے وقوف لڑکی! جل جاؤ گی۔“ وہ خالی ہاتھ نیچے کرتا ہوا اسے بغور دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

وہ پلٹیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر لائٹ دو بار آگے کرتے ہوئے بولی۔
”اچھا لگتا ہے آگ سے کھیلنا۔ میں چلنے سے نہیں ڈرتی۔“ اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور پھر نرمی سے لائٹ لیتے ہوئے بولا۔

”اچھی بات ہے ڈرنا بھی نہیں چاہئے۔ میں جو ہوں نا تمہارے قریب۔ تمہیں چلنے نہیں دوں گا۔“

”عینہ کے دل پر جیسے ایک بار پھر آگ کے چھینٹے پڑے تھے۔ بے ساختہ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تھا مگر وہ سر جھکائے دراز سے سگریٹ کا پینک تلاش کر رہا تھا اور وہ ایک بار پھر دل کو اپنی رگوں میں خون کی طرح دوڑنا ہوا محسوس کرنے لگی۔

اس کے ذمعی جملوں نے اس کے بدن کو جیسے شل سا کر کے رکھ دیا تھا۔
وہ پلٹا تو اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جسے وہ لائٹ کا شعلہ دکھا رہا تھا۔
”اور اب جو آپ اپنے اندر آگ اتار رہے ہیں۔ چلنے کا ڈر نہیں۔ یہ تو خاکستر کر دینے والی شے ہے۔“ وہ جانے کیسے جواباً ذمعی بات کہہ گئی۔ ایک دوپل وہ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دھواں بوسے باہر نکال کر دھیمے سے مسکرایا۔

”نہیں، تم جو پاس ہو کیا بدلے دو گی مجھے؟“ وہ اچانک اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا تھا۔ اس نے شپٹ کر چمکوں کی باڑھ کے ساتھ چہرہ بھی جھکا لیا۔ اسے اپنے ہر سام سے پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہونے لگا رخصار پتہ ہوئے محسوس ہونے لگے جیسے ان پر کسی نے دھکنا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ اس صورت حال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر تیزی سی اپنی جگہ سے اٹھی۔

ارے وہ میں اپنی چائے تو نانو کے پاس ہی بھول آئی ہوں۔“ عجیب بے نیکی پن سے وہ بہانہ بناتی دروازے کی جانب بھاگ لی۔
عمر نے بند دروازے کو دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا رہا پھر گہری سانس بھر کر بیڈ پر بیٹھ کر اس کی اونچی پشت سے ٹیک لگالی۔

اسے یکدم اپنی کنپٹیوں پر دباؤ سا محسوس ہونے لگا۔
شدید ترین احساس ندامت اور بے بسی کا غلبہ ہوا تو جڑے بھیج گئے۔ وہ بڑے بڑے کس لگا تا ہوا دھواں کچھ اندر اور کچھ باہر پھیلتا گیا۔
عینیہ کا معصوم، پاکیزہ شفاف حسن اس کی نگاہوں تلے لہرانے لگا۔
ایک بل وہ خود کو دنیا کا انتہائی غلیظ شخص محسوس کرنے لگا۔ خود سے کراہیت آئے گی۔

مگر دوسرے بل اپنی ذات پر لگائے گئے الزامات کے انگاروں کی تپش چھلانے لگی جو پتھر ٹھرہ نے مارے تھے اس کی اذیت ایک بار پھر شدت سے محسوس ہونے لگی۔
وہ کراہیت اور ندامت کے احساس سے نکل کر، پھر بے بسی کی ڈھال میں چھپ گیا۔

وہ ماضی کو فراموش کر سکتا تھا مگر اب حال کے اس واقعہ کو نہیں جس نے اس کی رگ



رگ کو نفرت آمیز انتقام سے بھر دیا تھا۔
میں پانچ دس سالہ عمر تیر نہیں ہوں ٹھرہ پھوپھو جو تزدلیل کے احساس کو گھول کر پی جانے پر مجبور تھا۔
میرے لاشعور میں بس اہانت کے اس سارے احساس کو بھی دفعتاً جگا دیا ہے
آپ نے اور میں اب جو میرے اندر اتارا گیا ہے آپ کی طرف سے۔
اس نے انگلیوں تک آ جانے والی سگریٹ کی سلگتی راکھ کو دیکھا اور آہستگی سے اسے جھٹکنا چاہتا تھا۔

”میں کیا کروں ایمن۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کتاب کھولتی ہوں تو بس وہی چہرہ نظر آتا رہتا ہے۔ کتاب میں لکھے الفاظ گم ہو جاتے ہیں۔ اور اسکی آواز۔ اس کی باتیں ذہن میں گونجنے لگتی ہیں۔“

”ایمن زور سے نفس پڑی۔ پھر قدرے بنجیدگی سے بولی۔

”چلو ٹھیک ہے یعنی..... مگر سوچو۔ اس طرح تو تمہاری پڑھائی سخت متاثر ہو رہی ہے۔ دیکھو محبت اپنی جگہ پڑھائی اپنی جگہ تمہیں اپنا فیوچر بنانا ہے۔ محبت کو راہ کی رکاوٹ مت بناؤ اسے محض دل کے اندر رکھو۔ خدا کے لئے اب رونے مت بیٹھ جانا۔ کتاب کھولو تو خود دل لگے گا“ وہ اسکی آنکھوں میں یکدم اندے والی نمی کو دیکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی تو وہ لب بھیج کر رہ گئی۔ پھر گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے بڑی بے دلی سے کتاب کھول کر مطلوبہ پچھڑ ڈھونڈنے لگی۔ ایمن نے نے مجلس کروہ چھوڑ کھول کر جھٹکے سے اس کے سامنے کر دیا اور دینیبی امیر نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ اس نے کھیا کر جلدی سے کتاب پر ہتھ ہیں جھکا دیں پھر کتنی ہی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ ایمن بھی اپنا جڑل کھول کر پڑھنے لگی۔

”ایمن!“ کئی لمبے توقف کے بعد وہ بولی تو ایمن چونکی مگر سر بھکائے جھکا نے ہی ”ہوں“ کہا پھر اس کی خاموشی پر اسراٹھا کر بولی۔

”کیا ہوا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے کیا۔“ اس کا اشارہ کتاب کی طرف تھا وہ سر ہلانے لگی۔

”ہاں۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا۔ تم سمجھاؤ نا۔“

”چلو پوچھو۔ کیا سمجھ نہیں آ رہا؟“ وہ بال بین جنرل پر رکھ کر اسے اور پھر کتاب کو دیکھنے لگی۔ تب وہ دھیرے سے بحر مانہ انداز میں بولی۔

وہ کہتے دنوں تک ”تیرور لا“ نہ جا سکی۔ اٹھتے بیٹھتے کبھی اسے اپنے ہاتھ اس کا وہ لمس محسوس ہوتا، کبھی اس کے جیسے سامعین سے ٹکرانے لگتے اور دل پہلو میں جھل جھل جاتا۔ بار بار وہ منظر یاد کرتی۔ وہ جیسے ذہن کی سطح پر لاتی، اور کتنی دیر تک دل کی دھڑکنوں کے شور کو سنتی رہتی۔ دھیرے دھیرے مسکراتی رہتی۔

اس روز ایمن کے ساتھ اسٹڈی کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان کتاب کی بجائے عمر کی طرف تھا ایمن نے اسے جھڑکا۔

”خدا کے لئے یعنی۔ پڑھائی پر توجہ دو۔ کل پیپر ہے اور تم ہو کہ فضول سوچوں میں کھوئی ہوئی ہو۔“

”جواباً اس نے ایمن کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا اور لب بھیج کر کتاب زور سے بند کر دی۔

”میں اس شخص کو شدت سے چاہتی ہوں ابھی۔ مگر کچھ میں نہیں آتا کہ وہ شخص کیا چاہتا ہے۔ کیا وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے اور اتنی شدت سے۔“

ایمن نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی چیز ہاتھ لگے جسے اٹھا کر وہ اس لڑکی کے سر پر کھینچ کر دے۔

وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بے ساختہ ہنسی کو نہ روک پاتی تھی۔

”بس..... نہیں پڑھا جاتا نا مجھ سے۔ دے دوں گی۔ پیچھے جیسے تھے۔“

اس نے کتاب زور سے بند کی اور دو دھکیل دی پھر دونوں پیرسکوڈ کر گھٹنوں پر تھوڑی کلائی۔

”میرا دل چاہتا ہے تمہارے دل کو اور عمر تیرو کو گولی مار دوں۔ جانے کہاں سے ٹپک پڑا یہ شخص۔ اور مرو تم محبت کی آگ میں۔ میں چلتی ہوں۔“ ایمن اپنی کتابیں اس کے منہس سینے لگیں تو وہ گھبرا گئیں۔

”کک..... کیا مطلب..... تم جاری ہو۔ ایسی پلیز ایسے تو مت کرو۔“ اس نے منت آمیز انداز میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”تو کیا کروں۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر لمبی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھروں۔ غم زدہ آہیں بھروں اور سنوں۔ بٹاؤ ہاتھ سدھرنا ہے تو سدھر جاؤ۔ کم از کم ایگزام کے دنوں میں تو دل و دماغ پر کنٹرول رکھو۔“

ایمن کی اس جھڑنے واقعی اثر کیا وہ سنجیدگی کے ساتھ کتاب کھول کر رٹا لگانے لگی۔



آخری پرچہ دے کر آئی تو اسے لگا جیسے اس کی روح کسی بوجھ سے آزاد ہو کر ہلکی

پھلکی ہو گئی ہو۔ وہ کتابیں ایک طرف ڈال کر نہا دھو کر سیدھی ”تیمور ولا“ پہنچی تو وہاں خاصی چہل پہل نظر آئی۔ شمن کی بہن اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ آئی ہوئیں تھیں۔ لاؤنچ میں خاصی رونق تھی۔ فہد کا لین پر بیٹھا کاشن گود میں دبائے کوئی لطیفہ سنار ہاتھ جس پر خود بھی ہنس رہا تھا اور سب کو ہنسا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا وہ شمن کو سلام کر کے اس طرف ہی آ گئی۔

”آؤ کرن۔ ابھی تمہارا بی ذکر ہو رہا تھا۔“

”میرا ذکر..... مگر ابھی تو تم لطیفے سنار ہے تھے۔“ وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

”تو تمہارا ذکر ہوا نا۔“ وہ برجستہ بولا تو حما اور مونا ہنسنے لگیں۔ جب کہ اس نے

صوفے سے کٹھن اٹھا کر اسے جڑ دیا۔

”تم ہو کے لطیفہ بلکہ لطائف۔ نا نو کہاں ہیں؟“ اس نے ادھر ادھر نظریں

دوڑائیں اور اٹھنے لگی کہ فہد نے اسکی کلائی پکڑ لی۔

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں

ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ ”مجھے پتا ہے دادو کا تو بہانہ ہے تم ابھی عمر کے

کمرے میں دوڑ لگاؤ گی۔“

وہ کلائی چھڑاتے ہوئے دھک سے رہ گئی۔ پہلو میں دل بے ترتیب سا ہوا۔

پلکیں جھپک کر اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ تو کیا اس کی بے تائیاں سب کو دکھائی

دینے لگی ہیں؟

”میں نا نو کے پاس ہی جاری ہوں۔ سمجھ تم۔“ اس نے بروقت خود کو سنبھالتے

ہوئے کہا اور پلٹ کر لاؤنچ سے باہر نکل گئی۔

فہد نے سچ ہی تو کہا تھا نا تو بہانہ تھا اس کے قدم چٹا بانہ انداز میں راہداری کے آخری والے کمرے کی طرف اٹھنے لگے اور ہر اٹھنے قدم کے ساتھ دل یوں دھڑکنے لگا جیسے ابھی پہلو سے نکل جائے گا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہلکے سے دباؤ سے ہی پورا کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی مگر کمرہ خالی تھا۔ اس نے درمیانی پردہ ہٹا کر دیکھا یہ حصہ بھی خالی تھا۔ البتہ واش روم کی جی جی رہی تھی اس کا مطلب تھا وہ اندر ہی تھا۔ وہ سینیں پیٹھ کے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔ اور یونی رائٹنگ ٹیبل پر آ کر ترتیب سے سچی ڈائریوں پر ہاتھ بھرنے لگی۔ ایک ڈائری کھلی ہوئی الٹی رکھی تھی یوں جیسے کوئی لکھتے لکھتے پاؤں سے پڑ جاتا ہو۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کی ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور ڈائری کھول کر اس کے ورق گردانی کرنے لگی۔

خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں کچھ آفس کا ورک تھا۔ کہیں کہیں حساب کتاب اور درمیان کے چند صفات پر شاعری رقم تھی۔

اس کے لمبوں کی تراش میں بے ساختہ ہی تحیر آمیز مسکراہٹ چمکی تھی۔ وہ پڑھنے لگی۔

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے

عہد و بیباں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

درد اتنا ہے کہ ہر رنگ میں ہے محشر برپا

اور سکون ایسا کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے

اس نے صفحہ پلٹا ایک اور نظم لکھی ہوئی تھی۔ وہ پڑھنے لگی کہ کسی نے پیچھے سے

اس کے ہاتھ سے نری سے ڈائری لے لی۔

”بہت بری بات ہے ایسی چیزیں بغیر اجازت نہیں اٹھائی اور پڑھی جاتیں۔“

وہ شرمندہ سی ہو کر جلدی سے کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ وہ نہا کر نکلا تھا کندھے پر گیلیا توڑی۔ پڑا تھا بالوں میں پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

”بس یونی نظر پڑی تو پڑھنے بیٹھ گئی۔ وہ جھینپ کر وضاحت کرنے لگی۔

”ہر چیز پڑھنے کی نہیں ہوتی۔“ اس کی بھاری دھیمی آواز بے حد قریب سے گونجی۔ پھر وہ اسی دھیمے لہجے میں بولا۔ ”دیے کچھ سمجھ میں آیا۔“

”نہیں..... اس قدر مشکل شاعری تھی اور اتنی اداس۔“ وہ سادگی اور صاف گوئی سے سرفہر میں ہلاتے ہوئے دور بیتی پھر کرسی کے ہستہ سے پر ہاتھ جماتے ہوئے اس کے ہاتھ میں موجود ڈائری کو دیکھ کر بولی۔ ”اس قدر اداس اور کبھی کبھی شاعری کیوں کرتے ہیں۔ آپ؟“

اس کی بات پر وہ زیر لب مسکرانے لگا اور ڈائری ٹیبل پر رکھ کر دوسری اٹھالی۔

”یہ میری نہیں فیض کی شاعری ہے جو میں کرتا نہیں پڑھتا ہوں۔ میں تو آج کل اس طرح کی شاعری پڑھنے اور لکھنے لگا ہوں۔“ اس نے سیاہ جلد والی ڈائری کھولی اور اسے تھمادی پھر پلٹ کر ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے جا کر برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔

اس نے ایک نظر اس کی پشت پر ڈالی پھر ہاتھوں میں تھما لی گئی اس ڈائری پر جس کے سفید براق صفحے پر اس کی ہینڈ رائٹنگ کسی موتیوں کی طرح بکھری دکھائی دے رہی تھی۔

میر زندگی میں بس اک کتاب ہے

اک چراغ ہے

اک خواب ہے اور تم ہو

یہ کتاب و خواب کے درمیاں جو منزل ہیں

میں چاہتا تھا

تمہارے ساتھ بسر کروں

یہی کل اٹھ سز زندگی ہے

اس کو زنا و سفر کروں

میرے دل جا دہ خوش پہ بجز تمہارے

کبھی کسی کا گزرنہ نہ

مگر اس طرح کہ تمہیں بھی خبر نہ ہو۔

دوسرے صفحے پر بھی ایک چھوٹی سی نظم تحریر تھی مگر اس سے مزید پڑھائی نہ گیا۔ تنہا ہوتی تو شاید ضرور پڑھتی بلکہ بار بار پڑھتی۔ مگر اس وقت اسے اپنے اعصاب پر ہلکا سا ارتعاش طاری ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے مگر اسے یہ نظم خود پڑھ کر سنار ہا ہو۔

ڈائری اس نے جلدی سے رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

وہ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے گداز ہونٹوں میں دھیمی مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جس نے اسے پلکیں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

کیا خیال ہے؟ یہ تو اداس اور تنہی بھی شاعری نہیں تھی۔ ”وہ بیروں میں سادی چیل ڈالتے ہوئے بولا اور پلیٹ کروا کر ڈوب کھولتے ہوئے اچانک یاد آنے پر بولا۔

”ارے ہاں۔ تمہارا ہر تھڈے گفت تو یونہی میری الماری میں ہی رکھا رہ گیا ہے۔“ وہ جلدی جلدی الماری میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

وہ چوکی، پھر مسکرا دی۔

”میری ہر تھڈے کو گزرے دو ماہ ہو چکے ہیں۔“

”اب کیا کیا جائے کہ کیا تو دو ماہ پہلے ہی تھا مگر خیال ہی نہیں رہا۔“ وہ پلٹا تو اس

کے ہاتھ میں ایک گفٹ بیک تھا جو اس نے اس کی طرف بڑھا دیا۔

”دیسے تو تھوہ وہی اچھا جو بروقت ملے اور خاص کر پیار بھرا تھو تو بروقت ہی ملتا

چاہئے۔ جذبوں کا تہمان بن جاتا ہے۔ اپنی دے۔ آئی ایم سوری فور ڈیٹ۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک گہری معذرت خواہانہ سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ دھڑکتے دل کے ہمراہ آگے بڑھی اور وہ گفٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا جو بے حد نفیس ریپر میں عمدہ طریقے سے پیک کیا ہوا تھا اور اس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔

ایک بے حد قیمتی لڑکی کیلئے۔

اس جملے نے اس کے خون میں شہ سادو ڈال دیا۔ وہ شوریدہ سر لہروں کے طوفان میں جیسے بہہ گئی۔

عمر تیور اپنے عام سے سراپے مگر مقناطیسی شخصیت کے ساتھ اس کی روح تک میں اتر گیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ جملہ قیمتی تھا۔

”تھینک یو عمر بھائی..... بھائی اس کے لئے اس کی آواز لڑکھڑائی۔

”اُس آل رائٹ۔“ وہ مہم سے انداز میں مسکرا دیا۔

پھر وہ خاصی دیر اس کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ عام سی گفتگو میں کبھی کبھی عمر کے ذوقی جملے اسے لمحہ بھر کے لئے شہنا دینے پر مجبور کر دیتے۔ کبھی اسے مہر بہ لب کر ڈالتے.... مگر پھر دوسرے پل وہ نیا موضوع یوں لے آتا کہ اس کا تاثر دھیمہ پڑ جاتا اور ایسے میں وہ شکر ادا کرتی۔

ہاں مگر تنہائی میں اس کی باتیں اس کی مسکراہٹیں اس کے دل میں طوفان بپا کر

دیتیں اسے لگتا وہ عمر کی محبت میں پور پور ڈوب چکی ہے۔ اس کی شخصیت کا سرخ حوض کا مقبذ پانی نہیں تھا بلکہ ایک رواں سمندر تھا جو اسے ٹھہرنے نہیں دے رہا تھا اور وہ تنہائی کی طرح بہتی

چلی جا رہی تھی اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت کے بحر میں گرفتار ہر شے سے بے خبر ہوتی جا رہی ہے۔

دھچکا تو اسے اس روز لگا بلکہ کبھی کو جب اس کا انٹرمیڈیٹ کا رزلٹ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”آئی ڈونٹ بیلوٹ مینی۔ یہ..... یہ تمہارا رزلٹ ہے؟“ شرہ حیرت زدہ تھی۔ وہ دوپروں میں رہ گئی تھی باقی کے نمبر بھی سوسو تھے۔

وہ مارے شرمندگی کے زمین میں گڑ گڑا گئی۔

عینہ بہترین نمبرز میں کامیاب ہونے والی عینہ سے کسی کو بھی ایسے ٹھٹھارے کا توقع نہ تھی۔ خود تیمور دلا میں بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی چونکہ وہ اتفاق سے اس وقت آتا تھا جب شرہ اسے خوب لتاڑ رہی تھیں۔ اور وہ صوفے میں دیکھی جھمی صرف آنسو بہا رہی تھی۔

اسی بات سے ڈرتی تھی میں۔ تمہارا روز تیمور دلا جانا یہی دن دکھا سکتا تھا۔“

شرہ نے کہنا تو یہ چاہا تھا کہ ”تمہارا عمر کے کمرے میں بھاگ بھاگ کر جانا یہی دن دکھا سکتا تھا مگر جانے کسی مصلحت کے تحت وہ صرف ”تیمور دلا“ کا کہہ کر رہ گئیں۔ البتہ انہیں اپنے خدشات کی آہٹ بے حد نزدیک محسوس ہونے لگی تھی۔

تیمور دلا میں بھی سب کو شک ابھ گیا تھا۔ خود عمر بھی چند ٹائپے اس خبر پر دنگ رہ گیا تھا۔ ذہن خالی خالی ہو کر رہ گیا کہ وہ اس خبر کو کس انداز میں لے اتنی ذہن عینہ کا ایسا رزلٹ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مگر نہیں اس کے اندر ایک صدا ابھی۔ جھوٹ بولتے ہوئے تمہارے لئے کم از کم یہ دھچکا نہیں ہے۔

اسے لگا جیسے کوئی اسے اندر سے جھنجھوڑ کر اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ وہ شرمسار سا ہو کر

لاؤنچ سے اٹھ گیا۔ وہ اماں جان کے پاس بیٹھی تھی۔ کبھی فردا فردا اس کے رزلٹ پر حیرت کا اظہار کر چکے تھے۔ ایک وہی چپ تھا۔ اس کے پاس نہ حیرانگی ظاہر کرنے آیا تھا نہ تعزیت۔ ڈنر کے بعد وہ خود ہی جانے سے پہلے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اسے دیکھ کر دراز کھول کر خود کو مصروف ظاہر کرنے لگا اور اس میں سے فائلیں نکال نکال کر بیڈ پر رکھنے لگا۔

روٹی روٹی آنکھیں اور متورم غم زدہ چہرے کے ساتھ وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی پھر خود استہزائیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔

”میں تو مختصر ہی رہی کہ آپ بھی آئیں گے اپنی حیرت ظاہر کرنے یا پھر دلا سے دینے یا مجھے شرمندہ کرنے۔ آپ کیوں نہیں آئے یہ فرض ادا کرنے؟“ وہ اندر چلی آئی۔

”کیا اب اس کی کنجاش رہ گئی تھی؟“ وہ نظریں بچاتا ہوا بولا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے جانے کیوں گریز کر رہا تھا جب کہ وہ ابھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یک دم وہ پر اعتماد اور خاص پیچورڈ سی نظر آنے لگی تھی شاید گہرے دکھ اور رنجیدگی کے باعث ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ بھی یہ فرض پورا کر لیتے تو اچھا ہی تھا۔“ وہ دھیرے سے بولی اور کارنر ٹیبل پر بے شوشیوں کو گھورنے لگی۔

”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے ہاں اگر اچھا رزلٹ آتا تو مجھے بے حد خوشی ہوتی بہر حال تم خود ہی یہ حق دے رہی ہو تو پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہو گیا؟“

وہ اس کے جھکے سر کو دیکھ رہا تھا تب ہی اچانک اس کی سسکیاں اٹھنے لگیں پھر سسکیاں تیز تر ہونے لگیں۔ وہ سہلچا کر رہ گیا۔ وہ چلتی تھی اور رواں آنسوؤں کے ساتھ بولی

بلکہ جینی۔

”میں نے“ میں نے بھی خود کپ چاہا تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے۔ اس طرح ہو جائے۔ اپنے آپ سے میرا اعتماد ٹھہ جائے۔ میں تنکے کی طرح اپنی سوچوں اور خیالات کے سیلاب میں بہہ جاؤں۔ یقین کریں اس طرح تو میں نے بھی نہیں چاہا تھا۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر بچکنے لگی یہ چوچھن خاصی پریشان کن تھی۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی اس کی طرف سے اس طرح کے ہچکا نہ رویے کی۔ اسے فوری طور پر تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا رد عمل اختیار کرنا چاہیے۔ پھر کچھ سوچ کر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے قریبی صوفے پر بیٹھا دیا۔ وہ ہنوز دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے روئے جاری تھی۔ اس نے نرمی سے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹا دیے۔

”تمہارے اس طرح رونے سے میں صرف الجھ سکتا ہوں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔“ اس کا لہجہ ٹھہرا ہوا اور قدرے پرسکون تھا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ صرف اور صرف بڑھائی پر توجہ دو۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم اپنا تمام تر دھیان اور توجہ اپنے انگیزام کی طرف رکھو۔“

”جھوٹ بولتے ہیں آپ۔“ وہ یکدم بھبھک کر کندھے پر دھرا ہوا اس کا ہاتھ جھٹک کھڑی ہو گئی۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ رخ پھیر کر کرب کے شدید ترین احساس کیساتھ لب دانتوں میں بے دردی سے کاٹنے لگی۔ ہاں بھلا وہ کس دلیل سے اس کی بات کو رد کر سکتی تھی۔ وہ کیوں کر اسے جھوٹ ثابت کر سکتی تھی۔

اس نے جو آج تک محسوس کیا تھا اس کی بنیادی بات تھی۔ کس بل بوتے پر وہ اسے مجرم ثابت کرتی۔ وہ تو ایسا شکاری تھا جو بنا جال ہی شکار کر ڈالتا ہے۔

اس کے ہاتھ خالی تھے کسی بھی الزام سے۔ وہ کس طرح اسے مجرم کے ٹھہرے

میں کھڑا رکھ کر کوئی الزام اس کے سر تھوپ سکتی تھی۔

وہ خود ہی پانچل تھی جو یواندہ وار اپنے دل کے ہاتھوں دوڑتے دوڑتے اس گلی میں آچکی تھی جہاں واپس پلٹنے کا کوئی راستہ بھٹائی نہ دے رہا تھا اور آگے..... آگے منزل کا مودوم سا نشان بھی جسے مودو دکھائی دے رہا تھا۔

وہ کس طرح اس شخص کا گریبان پکڑ کر چیخ چیخ کر حشر کو بتائے کہ اس..... اس شخص نے میری سوچوں پر قبضہ کر لیا ہے۔

مجھے اپنا امیر کر ڈالا ہے۔

اور وہ واقعی انجان تھا یا انماز برت رہا تھا۔

بہر کیف... اتنا نادان، کم فہم تو وہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اسکی آنکھوں میں بچے مہکتے اپنے عکس کو نہ دیکھ اور محسوس کر سکے۔

”عینیہ! ادھر دیکھو۔“ وہ باری سے پکار رہا تھا مگر وہ رخ پھیرے کھڑی رہی۔

ایسا لگ رہا تھا اس کا تمام مظنہ بہہ چکا ہو اور ساری خود اعتمادی برف کی طرح پکھل رہی ہو۔

وہ اس کے پلٹنے کا انتظار کرتا رہا پھر اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھا اور وہاں سے ایک ڈائری اٹھائی اس کا ایک سادہ صفحہ کھولا اور چمن اٹھاتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کیا پریشانی تھی وہ کوئی اہم وجہ تھی جس نے تمہیں دل جمعی سے پڑھنے نہ دیا۔ یہ ریزن تم اس میں لکھ دو۔“ وہ یوں بول رہا تھا جیسے کسی کم سن بچے کو پکار رہا ہو۔ وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ڈائری کے اوپر چمن رکھتے ہوئے بولا۔

”میں ہاتھ لینے جا رہا ہوں اس عرصے میں چاہو تو تم میرے اس مشورے پر عمل کر سکتی ہو۔ آگے تمہاری مرضی۔“

اس نے بس ایک نظر اس پڑالی اور بیڈ پر پڑا تو لے اٹھا واراڈوب سے اپنا چنگ
کیا سوٹ نکال کر ہاتھ روم میں بند ہو گیا۔

وہ کتنی دیر کھڑی اس مشورے پر سوچتی رہی کہ عمل کرے یا نہ کرے۔ پھر جیسے کسی
جذبے نے اسے کھینچا تھا۔ وہ آگے بڑھی احتیاطاً ہاتھ روم کے دروازے پر نگاہ ڈالی ایک
مہری سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر نفاذ کے سپرد کی اور بال پوائنٹ اٹھا کر ڈائری پر لکھنے
لگی۔



”ارے میں پوچھتی ہوں کیا اکلوتی اولاد ہونے کا مطلب ہے اسے سر پر چڑھا
دیا جائے۔ یہ سارا کادھرا اس کے باپ کا ہے۔ آنکھوں کا تار بنا کر رکھا ہوا ہے پھر تو یہی
دن دیکھنے ہوں گے۔“

شرمخت براخروختہ ہو رہی تھی۔ اماں جان نے اسے فہمائشی نظروں سے گھورا
اور جھنجھلا کر بولیں۔

”اب ختم بھی کر وشرہ۔ رات گئی بات گئی۔ تم تو لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی ہو بچی کے۔

لو پڑھائی نہ ہو گئی کوئی روز مشر کا حساب کتاب ہو گیا جس میں فیل ہو گئی۔“

”ہاں شرہ ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ بھلا آج سے پہلے اس نے کبھی تمہیں باپوں

کیا ہے۔“ ثمن بھی اسی کی طرف داری کرتے ہوئے بولی تو شرہ کے سینے سے ایک کھینچی

کھینچی اعصاب شکن سانس برآمد ہو گئی۔

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہی بات تو تشویش میں مبتلا کرتی ہے کہ اب کیا

ہو گیا ہے اور کیوں ہوا ہے۔

انہوں نے سر جھٹک کر تپائی پر رکھا چائے کا گلاس اٹھا لیا جس پر گلدی سی تہہ جھم گئی تھی

جو اس کے ٹھنڈی ہو جانے کی غمازی کر رہی تھی۔

”اب یہ ٹھنڈی ٹھار چائے پیو گی۔ لاڈیہ دے دو میں گرم لے آتی ہوں۔“ ثمن

نے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا اور وہ یونہی بے خیالی میں ہنسی رہی۔

”پڑھائی تو ہوتی رہے گی۔ تم اس کی شادی کا سوچو۔ اب فہد نے الگ باہر جانے

کی رٹ لگا رکھی ہے مگر تیمور اسے کسی بندھن میں باندھے بغیر بھیجنے کا نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو

میں بھی دل سے نہیں چاہتی کہ چھڑے کنوارے کو باہر بھیج دیا جائے۔“

اماں جان ٹیکے کے نیچے سے تسبیح نکالے بول رہی تھیں۔ شرہ نے چونک کر ان کی

شکل دیکھی پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے اب مجھے جلد ہی اس فرض سے فارغ ہو جانا

چاہئے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے کمرے میں داخل ہوتی ثمن کو دیکھا اور بولیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے ثمن؟ اماں کہہ رہی ہیں فہد کو تیمور بھائی نکاح منگنی کرنے

کے بعد ہی بھیج سکتے ہیں۔ کتنے سال کے لئے وہ جانا چاہ رہا ہے؟“

ثمن چائے کا گلاس دے کر اماں کے تحت پر بیٹھ گئی اس موضوع پر اس کا چہرہ

کچھ کھل اٹھا تھا۔

”ہاں تیمور اور خود میں، بلکہ اماں بھی یہی چاہتے ہیں مگر تم اور سلمان بھائی کچھ

عند یہ دو تو بات بنے نا۔“

ان کی بات پر شرہ بے ساختہ ہنس دی۔

”لو میرے عند یہ کی کیا بات ہے۔ یہ تو بچپن سے طے ہے کہ عزیہ تمہاری اور

نیمور بھائی کی بیٹی ہے اور فہد میرا بیٹا ہے۔ یہ رشتہ تو ہم یعنی کے پیدا ہوتے ہی طے کر چکے

ہیں۔“

”بچپن کی بات اور ہوتی ہے شرمہ۔ اتنا وقت گزر جائے تو کیا سے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ ذہن بدل جاتا ہے سوچیں خیالات بدل جاتے ہیں۔“

شمن سنجیدگی سے بولی۔ شرمہ کا دل ایک لچلے دھڑکا۔ اس کے تصور میں عینہ کا سراپا لہرایا..... ایک سوچ نے ڈنک مارا۔ اس سے پہلے کہ بیٹی کا ذہن بدلے اس کی سوچیں بدلیں۔ اسے واقعی کوئی فیصلہ کر دینا چاہئے۔

گرم گرم چائے ہوٹوں سے نکرائی تو وہ چونکی پھر لیوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولیں۔

”میری طرف سے آپ اماں اور تیمور بھائی آج ہی عینی کو گٹھلی پہنا دیجئے۔ جب چاہیں آ کر گرم کر لیں اور چاہیں تو نکاح کر دیں۔ جو مناسب سمجھیں۔ میرے پاس تو وہ امانت ہے۔ آج نہیں تو کل آپ کو دینی ہی ہے۔“

شرمہ کی بات کے اختتام پر اماں اور شمن نے شرمہ کو انتہائی مسرور نظروں سے دیکھا۔ شمن کی تو مارے خوشی کے ہاتھیں کانوں تک جا پہنچی تھیں۔

”لو مجھے خبر ہوئی کہ اتنی بڑی خوشیوں میں بیٹھے بیٹھے آج ہی مل جائے گی تو میں کچھ ٹیٹھا دیکھا پکا ذاتی خیر فرج میں کل کی رس ملائی تو رکھی ہوئی ہے ویسی لگتی ہوں۔“ وہ لپک چھبک اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر بھاگی۔ شرمہ اور اماں بے اختیار ہنسنے لگیں۔



بڑی امید تھی کار جہاں میں دل سے مگر

اسے تو تیری طلب میں خراب ہونا تھا

عمر کتنی دیر ڈائری کو گھورتا رہا۔ اس پر لکھے الفاظ اسے ابھی ہوئی کر لکیروں کی طرح محسوس ہونے لگے تھے۔ اسے اپنے ذہن پر شدید قسم کا دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔

یہ کوئی اس کی توقع کے خلاف نہ ہوا تھا وہ کچھ اسی طرح کے رد عمل کے لئے تیار تھا۔ اس کے باوجود کوئی چیز اس کا دل مٹوئے نہ تھی۔ روح میں چٹکیاں بھر رہی تھی۔ ڈائری بند کر کے اس نے بھیجی بھیجی سانس بھری اور ڈائری بے دلی سے رائٹنگ ٹیبل پر پھینک دی اور کھڑکی کی سلاخ کھول کر باہر لان کے سناٹے کو گھورنے لگا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ ملک باسا اندھیرا ہر شے کو ڈھانپ رہا تھا۔ ہوا سا کن تھی ایک پتا تک ندہل رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ہر شے کو کسی نادیہ خوف نے چپ کی مہر لگا دی ہو۔ ایک وحشت سی برقی محسوس ہو رہی تھی ہر پودے سے۔

اس نے اچانک لب بھینچ کر سلاخ ایک کھٹکے سے بند کیا پھر سلاخ کے ہیشے کو گھورتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ایک دو گہری گہری سانس لیں اور پلٹ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ اور شرمہ جا چکی تھیں۔ صبح سے نظر آنے والی چہل پہل دم توڑ چکی تھی۔ شمن اپنے کمرے میں تھی وہ اماں جان کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اپنے تخت نما پلنگ سے ٹپک لگائے تسبیح پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں اور پاؤں سمیٹ کر اپنے قریب ہی جگہ بنائی۔

”چلو تمہاری بھی شکل نظر آئی۔ میری بھی عید ہوئی۔“ اپنا تبت بھرا شکوہ ہمیشہ کی طرح کیے بنا نہہ سکیں۔ اب تو وہ عادی ہو چکا تھا مسکراتے ہوئے ان کے برابر تک گیا۔

”سارا سارا دن آفس میں سر کھپاتے ہو اور پھر آتے ہی کمرے میں بند ہو جاتے ہو۔ ایک دن چھٹی کا ہوتا ہے اس میں بھی تم باپ بیٹے کی شکل نظر نہیں آتی۔ وہ الگ فائلیں تھامے گھر میں گھومتا ہے اور چشمہ چڑھا کر ان کا غڈوں میں سر کھپانے لگتا ہے۔“

وہ ہنس رہا تھا کیا کہتا شکوے بجائی تھے وہ اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہی رہتا تھا۔

باپ کا سارا کاروبار سنبھال لیا ہے تم نے، ایک وہ فہد ہے کہ کدکڑیاں مارتا پھرتا ہے۔“

یہی تو عمر ہوتی ہے دادی جان کہ کدکڑیاں مارنے کی۔ سمجھ آ جائے گی وقت کے ساتھ۔“

وہ اونچا ہو کر گاؤں کیلے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اماں نے چشمہ کے اوپر سے اسے گھور کر دیکھا۔

”بچہ ہے وہ۔ صرف تین سال ہی تو چھوٹا ہے تم سے اس عمر میں بھی سنجیدگی اور پختگی نہیں آئے گی تو کب آئے گی۔“

”پختگی کے لئے عمر کی ضرورت نہیں ہوتی یہ تو ایک لمحہ ہوتا ہے کوئی لمحہ زندگی میں ایسا آتا ہے انسان بدل کر رہ جاتا ہے سرتاپا۔“ اس نے دھیرے سے سانس خارج کی اور

بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ذرا سا مسکراتے ہوئے بولا۔

”شکر کیجئے وہ پچھوڑ نہیں ہوا۔ ورنہ آپ کو اس سے بھی شکوے ہونے لگتے کہ وہ بھی شکل نہیں دکھاتا کہ کدکڑیاں لگاتا نظر نہیں آتا۔“

”اچھا بس..... رہنے ہی دو تم تو۔ یہ بتاؤ اب شادی بھی کرنی ہے یا اسی طرح ہی گھومتے رہو گے۔ دیکھو میاں میں کہتی ہوں سیدی سیدی اپنی پسند بتا دو۔ فہد سے پہلے میں تمہیں کھونٹے سے باندھنا چاہتی ہوں۔“

وہ تسبیح کیلے کے نیچے ڈال کر باقاعدہ ناراضگی سے گویا ہوئیں۔

”اوئے سوئے یہ کہے کھونٹے سے باندھا جا رہا ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔“ فہد اماں کے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو اماں کا جملہ ساعت سے ٹکرایا۔ وہ کرسی کھینچ کر وہیں آ کر بیٹھ گیا۔

عمر نے مسکراتی نگاہ فہد پر ڈالی۔

”اس کی بات کر رہی ہوں۔ شادی کر رہی ہوں اس کی۔ میں پکا قصد کر لیا ہے۔“

اماں جان گویا غریب تھی۔

کس کے نصیب اتنے روشن تاباں ہو رہے ہیں۔ وہ کون خوش نصیب ہے ذرا میں بھی تو سنو۔ مبارک ہو بھئی بہت بہت مبارک۔“ فہد یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر عمر سے بھنگیر ہوئے کو اس کی سمت جھکا تو اماں نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

”ارے یہ لڑکا مانے تو کسی کا نصیب کھلے نا۔“

انہوں نے عمر کو گھورا پھر قطعی لہجے میں بولیں۔

سن لو کان کھول کر اگر تمہاری کوئی پسند نہیں ہے تو بس پھر یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اور شن ڈھونڈ لیں گے کوئی۔“

”آں..... آں..... آپ..... ڈھونڈیں گی۔“

فہد نے آنکھیں پھاڑ کر اماں جان کر دیکھا پھر مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔

آپ یہ کام نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اپنے چھٹی سو سال کی بڑھیا ٹاپ کی لے آئیں گی۔ کیوں کہ آپ کو تو آج کی ہر لڑکی مغرب زدہ فیشن ایبل نظر آتی ہے۔ آپ کہیں گی موٹی پر کٹی تھی ذرا نہ بھائی کسی کے منہ میں چوہنم دیکھ لیا تو غرلی کہہ دیں گی۔ کس نے انگلیں جھاڑ دی تو اس پر تو اگر بڑی کاٹھپنگ جائے گا۔“

فہد کی شرارت پر عمر مسکرائے جا رہا تھا جب کہ اماں ادھر ادھر کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھیں۔ جو فہد کو کھینچ کر مارکیں پھر جھک کر چہل ہی اٹھالی اور ٹھائیں سے اس کے گھٹنے

پر دے ماری۔

چل جھوٹا کہیں کا۔ آج تک میں نے کسی میں عیب نہیں دکھا لے۔ خدا نہ کرے مجھے

کیوں بچیاں عیب دار نظر آنے لگیں۔“ انہیں اپنے اوپر یہ الزام ذرا نہ بھایا تھا۔
”مجھے تو ساری بچیاں ہی اچھی لگتی ہیں بس یہ مانے تب نا۔“ ان کی تان پھر عمر پر آ کر ٹوٹی۔

خدا خیر کرے۔ ساری زور کس پر ہوا ساری پر۔ واہ عمر پھر تو پیش ہو گئے۔ ایک نہیں ”ساری“ مل رہی ہیں۔ میری مانو تو ایسا گولڈن چانس مس مت کرو فوراً سے پیشتر ہاں کر دو۔“

فہد نے پھر اماں جان کو چڑا دیا وہ اسے گرم نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر ایک گہری سانس بھر کر بولیں۔

”تجھے بھی نکیل لگے گی تب ہی سدھرے گا۔ شمن تو کل ہی شرہ کے یہاں جا کر عینہ کو انگوٹھی پہنائے جانے پر کمر بستہ ہے۔ بس میں نے ہی روک رکھا ہے۔“ وہ اب فہد سے مخاطب تھیں۔

”شرہ آئی تھی کل اور اپنی رضا مندی دے گئی ہے۔ تیور اور میرا ابھی خیال ہے کہ تمہارا نکاح کر دیا جائے۔ پھر یہ باہر بھیجا جائے الگ جان کو آگے ہو تم ہم سب کی۔ اب اسی شرط پر بھیج سکتے ہیں تمہیں۔“

”کیا... آ...؟“ فہد گویا دو فٹ اچھلا تھا کرسی سے پھر بجائے کرسی پر بیٹھنے کے اماں کے تحت پر آ کر بیٹھ گیا۔

”کیا کیا... کیا کیا پاپائے باہر جانے کی اجازت دے دی آخاہ... اوہو۔“ وہ بیٹھے بیٹھے اچھلنے لگا اور اماں سے لپٹ گیا۔

آپ کتنی سوئٹ ہیں دادو۔ کتنی لوگ ہیں۔“ وہ چٹ بٹ ان کا منہ چومنے لگا تو انہوں نے اسے پرے دھکیلا۔ اچانک وہ چونک کر بولا۔

”مگر دادی جان ایہ... یہ معنی اور نکاح کا کیا ذکر یہاں۔ وہ بھی اس احمق بانگڑو سے۔ یا اللہ یہ میری سماعت پر دھوکا تو نہیں ہوا۔ ذرا دو بار کہیے کچھ ایسی بات کہی کہ میں ہی غلط سمجھا۔“

”باز آ فہد اپنی شرارتوں اور غیر سنجیدگی سے۔ ٹھیک سنا ہے تمہارے کانوں نے۔ نکاح ہو گا تمہارا عینہ سے۔ پھر ہی تمہیں جانے کی اجازت دی جائے گی۔“

”کیوں یہ دم چھلا گا کر آپ لوگوں کو کیا میری شرافت کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ میرا کتواہ پن آپ کو اس قدر بے اعتبار محسوس ہوتا ہے۔“ وہ کسی کم سن ناراض بچے کی طرح منہ پھلا کر اماں کو دیکھنے لگا تو وہ ہنس پڑیں۔

پھر وہ مصروفی ناراضگی ایک طرف ڈال کر بولا۔
”واقعی پاپائے باہر جانے کی پریشانی دے دی ہے ناں۔“ اس کا لہجہ اب بھی کچھ کچھ بے یقین سا تھا۔ اماں جان سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

”ہاں مگر اسی شرط پر۔“
”ارے مان لیں گے مان لیں گے۔ ساری شرطیں مان لیں گے بس ایک بار باہر جانے تو دیں۔“ وہ ایک بار پھر اسی خوشی سے دوچار ہو گیا۔ تخت سے اٹھتے ہوئے ذرا سا جھک کر پھر اماں کو چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

”پھر بھی ذرا ای سے کنفرم تو کر لوں۔ آپ کا کیا بھروسہ یونہی بھلانے کو کہہ دیا ہو۔“ اور اماں جان کا ہاتھ چیل کی طرف اٹھا دیکھ کر چھپا کر سے کمرے سے نکل بھاگا۔

”لو دیکھو ذرا اب میں اس عمر میں جھوٹ بولوں گی۔“ انہوں نے رخ عمر کی طرف کیا جو تخت سے اتر کر بیروں میں چلیں پھنسا رہا تھا۔

”تم کہاں چل دیے ابھی تو تم نے منشا باقی ہے۔ ارے تم دونوں بھائیوں کی جگہ

دو بیٹیاں ہوتیں تو کبھی کی پکار کر بیاہ دی ہوتیں۔ مجال ہے جو اتنا سرچڑھایا ہوتا۔ عمر میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ تم کدھر بھاگ رہے ہو۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے ذرا سار کا مگر پلٹا نہیں۔

کان کھول کر سن لو۔ تم نے اپنی سی کر لی بہت اب ہمیں اپنی سی کرنے دو۔“ ان کے لہجے میں تنذیب تھی وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور پلٹے بغیر ہی بولا۔

”ابھی میں نے اپنی سی کہاں کی ہے۔“ پھر وہ رکائیں اور اعصاب شکن احساس کے ساتھ کمرے سے باہر آ کر کی بورڈ سے گاڑی کی چابی لی اور پوریکلو کی طرف نکل گیا۔



دل جنگل دل صحرا لوگو

دل جنگل دل صحرا

اڑتی بھرتی ریت کا دریا

سرد ہوا کا شور

کہیں کہیں کوئی دیپ سنگت

گھوڑا ندیرا گھوڑا

کبھی کبھی کوئی بھٹکا بادل

دھوپ رتوں کا زور

ڈالی ڈالی پھٹی پھٹکیں

مکھیل ہوئی ڈور

دل پاگل دل ضدی بچہ

دل جنگل دل صحرا لوگو

دل جنگل دل صحرا لوگو

وہ واپس لوٹا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اماں جان کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی البتہ لاؤنج کی بتی روشن تھی مگر وہ بے نیاز اپنے کمرے کی طرف بڑھا کہ ٹخن لاؤنج سے باہر آئی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ احترام بھی لازمی تھا۔ وہ سامنے ہی آ کر کھڑی تھی۔

اس نے سرسری انداز میں سلام کیا تو وہ سر کو جنبش دے کر جواب دیتے ہوئے بولیں۔

”کبھی ہمارے درمیان بھی رہو تو تمہیں کوئی جبر بھی سنائے۔“

وہ سر سے پیر تک جائزہ لیتیں نظریں ڈال کر وہ کھے لہجے میں بولیں۔

یہ لہجہ اس کے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ مبہم سے انداز میں مسکرا دیا۔

”جو خبر آپ سنانا چاہتی ہیں اس سے میں پہلے ہی باخبر ہوں۔“ وہ قطعی اطمینان

سے کہتا ان کے دائیں طرف سے ہو کر آگے بڑھ گیا پھر اپنے کمرے کے دروازے کے

بہنڈل پر ہاتھ رکھ کر پلٹا تو وہ بھی رخ موڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جلدی سے بولیں۔

”تو اتنا نہیں ہوا کہ مبارک بادی ہی دے دیتے بھائی ہو اس کے۔“

وہ اب بھی بغیر برامنائے اپنے چہرے کھڑا دیو سے نارل ہی رہا۔

دھیمی مسکراہٹ ہنوز اس کے ہونٹوں کے گوشوں پر موجو رقص رہی۔

”اتنا کم طرف ہرگز نہیں ہوں کہ کسی کی غلطیوں اور کسی کی نفرتوں کا بدلہ کسی اور

سے لوں۔ دے دوں گا مبارک بھی مگر پہلے یہ کام اپنے تکمیل تک تو پہنچے۔ کوئی باقاعدہ رسم

تو ہو۔ فہد کو سب سے پہلے گلے لگا کر پیر کرنے والا میں ہی ہوں گا۔“

یہ کہہ کر ان کی طرف سے کسی قسم کے جواب کا انتظار کیے بنا کمرے میں جا کر

شانگسی سے دروازہ بند کر گیا۔

اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ مفقود ہو چکی تھی اور ہونٹ سختی سے باہم بھینچ گئے

تھے۔ بدن پر پڑی شرٹ اتار کر ایک طرف پھینکی اسے ہی آن کیا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔



وہ اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر کے دو دن بعد ”تیورولا“ آگئی تھی اس روز ڈائری میں لکھنے کی حافیت کرنے کے بعد وہ حوصلہ ہی نہ کر پائی تھی اس کا سامنا کرنے کا۔ مگر اب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر ادھر آگئی مگر آئی بھی صبح کے وقت۔ اس کا خیال تھا بلکہ اسے پکا یقین تھا کہ وہ تیورائل کے ساتھ آفس کے لئے نکل گیا ہو گا۔ مگر اس کا سانس سینے میں دب کر رہ گیا۔ جب وہ لان میں ہی کھڑی اٹھائی سے باتیں کرتا ہوا دکھائی دیا۔

اس نے چاہا کتر اگر گزر جائے مگر وہ اسے دیکھ چکا تھا اور بالی کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے انکی طرف چلا آیا۔ وہ وہیں ٹاریل کے سنے کے ساتھ گویا چپک سی گئی۔ سائڈ پر چنبیلی کی باڑھ کی شاخیں لہرا رہی تھیں وہ ادھر ہی آ کر رکھا تھا۔

”کک۔ کیسے ہیں آپ“ وہ نظریں بھگا گئی۔

جیسا دکھائی دیتا ہوں۔ خود دیکھ لو کیسا نظر آرہا ہوں۔“ اس کا انداز پر گھٹتہ سا تھا۔

عینہ کو اپنی ہتھیلیاں ٹھنڈی پڑی محسوس ہوئیں۔ ذرا سا چہرہ اٹھایا مگر پلکیں اٹھانے

سکی۔

”آؤ۔ ادھر بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ لمحے کے توقف کے بعد وہ

بولتا تو اس نے یک بیک پلکیں اوپر اٹھائیں پھر قدرے شپٹا کر بولی۔

”آ۔ آپ پلیز۔ وہ ڈائری کا ذکر کس سے بھی مت کیجئے گا۔“

وہ کین کی خوش نما کرسیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، ہٹھک کر رک کر اس کی طرف

دیکھنے لگا۔ ایک دم لمحے دیکھتا رہا پھر بھاری مگر دیسی آواز میں بولا۔

”بس۔ اتنی ہی ہمت تھی۔ محبت تو بے خوف اور نڈر بناتی ہے۔ خوف تو محبت کی

صدائق کو مشکوک بناتا ہے۔ جسے چاہا جائے اسے تو کم از کم بے خوف ہو کر یقین دلایا جائے۔“

وہ سن ہی ہوئی تھی۔ اسے اپنے اعصاب پر ایک ارتعاش طاری ہوتا محسوس ہوا۔ وہ اس کے بے حد قریب آ کھڑا ہوا تھا اتنا کہ اسکی آنچ وہ اپنے دل پر محسوس کرنے لگی۔ اسے اپنا دل سینے کی دیوار سے کسی دیوانے کی طرح ٹکراتا محسوس ہونے لگا۔ مگر وہ اس کے دل کی دنیا سے بے خبر۔ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بے حد نرمی سے رکھ کر ہلکا باؤ ڈال رہا تھا۔ یوں جیسے بادباصی کھڑی میں کھٹنے والے شگুন کو ہولے سے چھوئے۔

وہ کتنی دیر اپنی جگہ کھڑی اپنے دل کی دھڑکنوں کے شور کو سنتی رہی۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ جا چکا ہے۔ چونکی تو وہاں اب وہ تھا تھی بس اس کی آواز کی خوشبو کھری ہوئی تھی۔

اس کے وجود سے اٹھنے والی مہک کا احساس باقی تھا۔ اس نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری اور اپنے ہاتھ کو دیکھا جہاں اب بھی ہلکا سا ارتعاش طاری تھا۔ اسے لگا جیسے کوئی طوفان اسے چھو تا گزر رہا ہو۔ مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ طوفان گزرنے کے بعد تنہا یاں نہیں آئی تھیں بلکہ ایسا لگ رہا تھا دل کے شگونے اور کھرمے ہونے جذبے ثمر بار ہو کر لہلہانے لگے ہوں۔

محبت اپنی تہدی کے ساتھ رواں ہو گئی ہو۔

اس نے اس کا روکو پور ٹیکو سے نکلنے دیکھا پھر وہیں چنبیلی کی باڑھ سے لگ کر کھڑی ہو کر آنکھیں موند لیں۔

اسے کہو کہ بہت نامراد شے ہے جنوں

اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

وہ اندر جانے کی بجائے چپکے سے باہر نکل آئی اور گھر کی طرف چل دی۔
 شمن مٹھائی اور عینیکے کیلئے دو جوڑے اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں آ کر دے گئی
 تھی اور جھوکو باقاعدہ رسم کرنے کا بھی کہہ گئی تھیں۔ شمرہ نے یہ ساری چیزیں اسے دکھائیں
 تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے اعصاب پر زبردست پتھر پڑا تھا۔
 ”سب کیسی رسم۔ کیا مطلب؟“
 ”کس بات کا مطلب۔“ شمرہ نے ابرو چکا کر اسے دیکھا۔ اس کے رویے کی
 حیرانگی اور چہرے پر پھیلنے والے اضطراب نے انہیں جیسے اندر ہی اندر خبردار کر دیا کہ وہ اس
 کے لئے قطعی تیار نہیں تھی جتنی طور پر۔

”ای امی پلیر یہ مذاق چھوڑیں میں۔“

”یہ مذاق نہیں ہے جھوکو تمہاری معافی ہے فہد کے ساتھ اور اسی مہینے کے آخر میں
 باقاعدہ نکاح بھی ہو جائے گا۔ فہد باہر جانا چاہ رہا ہے اس لئے یہ سب وقت سے پہلے کر تیار
 رہا ہے اور یوں میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ میں اس فرض سے جتنی جلدی ہو سکے سبکدوش
 ہو جاؤں۔ آج نہیں تو کل ہونا تو ہے۔ یہ پھر ٹیک کام میں دیکر یوں کریں۔ دیکھو یہ جوڑا
 کس قدر پیارا ہے۔ تمہیں گولڈن براؤن رنگ پسند ہے نا؟“ شمرہ ڈبے سے کامدانی کا جوڑا
 نکال کر اسے دکھانے لگی۔ اور وہ پتھر کی طرح ساکت اپنے بھاری ہوتے وجود کے ساتھ
 جیسے دھیرے دھیرے ڈھلے رہی تھی۔ اگر کسی کا سہارا نہ لیا ہوتا تو ضرور لڑکھڑاتی۔

”شمن نے کہا بھی تھا کہ عینیکو لے جاؤ گی اس کی پسند سے کپڑے لوں گی مگر
 میں نے منع کر دیا۔ تمہیں سر پرانز دینا چاہتی تھی۔ ہاں نکاح کا جوڑا تمہاری اپنی پسند کا ہی ہو
 گا۔

”ای امی پلیر، چپ ہو جائیے۔ چپ ہو جائیے۔“ وہ اچانک جذباتی انداز میں حلق پھاڑ کر

جینٹی۔ پھر وہیں ان کے قریب بیٹھ کر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔
 ”عینیکہ..... عینیکہ“ یہ کیا پاگل پن ہے۔“ شمرہ کا دل لمبے بھر حیرت اور دکھ سے
 کٹا۔ مگر دوسرے پل وہ لہجے میں کرختگی سو کر اس کا سر اونچا کرنے لگی مگر اس نے ان کا ہاتھ
 جھٹک دیا۔

”میں فہد سے شادی نہیں کروں گی ماما۔ ہرگز نہیں آپ لوگ مجھے بتائے بغیر
 میری زندگی کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔“ نو نیور۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیٹھ پر رکھی چیزیں ادھر
 ادھر کھینچ دیں۔ چپل کا ڈبہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

”یہ سب..... یہ سب میری خوشی کیلئے ہے۔ میں۔ میں۔ میں فہد سے شادی۔“

اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ شمرہ کا ہاتھ پوری قوت سے اس کے چہرے پر پڑا
 تھا۔ اور چند لمبے کے لئے دونوں ہی ساکت ہو گئیں۔ وہ دکھ اور گہرے صدمے سے ماں کا
 چہرہ نکلنے لگی جبکہ شمرہ اذیت اور ندامت کے احساس کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ پھر ایک
 گہری سانس بھر کر بیٹھ سے اترتے ہوئے بولیں۔

”میری محبت کا یہ صلہ دو گی تم۔ ایک ماں سے گستاخی کر دو گی۔ یہ سب تو ہم نے
 تمہاری خوشی کے لئے کیا ہے۔ شمن تمہیں اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہے۔ تم یہ صلہ دو گی
 اسے۔“

”مجھے کب ان کی محبت سے انکار ہے۔ مگر فہد ہی کیوں عمر بھی تو ان ہی کا بیٹا
 ہے۔“

”عینیکہ“ شمرہ نے اسے کھانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

وہ جس خوف کی آہٹیں کب سے محسوس کر رہی تھیں وہ آ کر کاران کے دروازے
 کے اندر قدم رکھ چکا تھا۔ وہ یقین بن کر آج سفاک حقیقت کی طرح سامنے تھا۔ وہ ان کے

لجے کی گرمی سے قطعی متاثر نہ ہوتے ہوئے اور درک صرف عمر کا نام لیتی رہی۔

”اگر عمر سے نہیں تو پھر کسی سے بھی میری شادی نہیں ہوگی۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ گئی تھی اور شمرہ کی بوسیدہ درخت کی طرح کرسی پر گرسی گئیں۔ تو عمر تم نے، تم نے آخر کار یہ جنگ جیت لی۔ مجھ سے درپردہ انتقام لے لیا۔ مگر نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں۔ میں تمہارا یہ مشن ہرگز پورا نہیں ہونے دوں گی۔ آئی ہیٹ یو۔ تم۔ تم میری بچی کے بالکل بھی قابل نہیں ہو۔“

وہ غصے سے انھیں اور ساری چیزیں سیٹھ کر الماری میں رکھ کر کمرے سے باہر آ گئیں۔ ان کے قدم پورٹیکو کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے وہیں سے ڈرائیور کو آواز دی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔

کچھ دیر بعد ہی وہ تیمور دلا میں اماں جان کے پاس بیٹھیں بے آواز رو رہی تھیں۔

اماں جان عینیہ کی طرف سے ہونے والے انکار پر دنگ سی رہ گئیں۔

”آخر کیا خرابی ہے فہد میں؟ کیوں انکار کر رہی ہے کیا وجہ ہے؟“

”وجہ جو بھی ہو مجھے اس سے سروکار نہیں ہے اماں بس آپ اسے سمجھائیے۔ کسی طرح سختی سے، نرمی سے۔ اور ہاں جمعہ کو آخر انگوٹھی پہنا جائے گا۔ اس نے بھی ابھی میرا پیار دیکھا ہے غصہ نہیں۔“

”لو دیکھو ذرا۔ آج کی نسل کا تو داغی ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔ بزرگوں کے فیصلے قبول نہیں ہیں انہیں۔ ماں باپ بھلا برا جاتے ہیں ان کا تم کمر مت کرو شمرہ میں کل ہی آئی ہوں اس کا داغ ٹھکانے لگانے۔ اماں جان نے سخت برا مانا تھا۔ انہیں عینیہ کا یہ طرز عمل بہت کھلاتا تھا۔

وہ وضو کیلئے غسل خانے میں چلی گئیں۔ شمرہ وہیں تخت پر لیٹ گئی۔

ان کا داغ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا۔ بیٹی کے اس قدر بے چلک انکار نے انہیں شدید دھچکا پہنچایا تھا۔

شمن گھر میں موجود نہیں تھیں۔ فہد کیساتھ بازار گئی تھیں وہ اس کے آنے سے پہلے ہی چلی گئی اور اماں کو بھی کہہ دیا کہ شمن کو ابھی کچھ خبر نہ ہونے پائے۔ نہ تیمور کو کچھ بتایا جائے مگر آخر کب تک یہ بات چھپ سکتی تھی۔ عینیہ نے رورور کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ باپ کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے شمرہ کی بجائے بیٹی کی حمایت کی۔ ”آخر فہد اور عمر میں فرق ہی کیا ہے۔ ایک ہی خاندان کے لڑکے ہیں دونوں۔ دونوں ہی جیسے ہیں تمہارے۔ فہد نہ کسی عمر کسی۔ یوں بھی وہ بڑا ہے پہلا حق اسی کا بنتا ہے۔“ اور شمرہ سر ہٹا کر رہ گئی۔

ادھر اماں جان کے علم میں بھی انکار کی وجہ آئی تو وہ چپ سی ہو کر رہ گئیں۔ ان کے خیال میں ”وجہ“ کچھ نامناسب بھی نہ تھی۔ وہ عمر کو پسند کرتی تھی۔ اسے اس نظر سے دیکھتی تھی۔ تو اس میں برا بھی نہیں تھا۔ اسے کب بتایا گیا تھا کہ بچپن سے ہی وہ فہد سے منسوب ہے۔

انہیں فہد سے دشمنی نہ تھی۔ مگر عمر سے جو قلی لگاؤ تھا اس کے پیش نظر انہیں عینیہ کے اس فیصلے سے شاک نہیں لگا تھا بلکہ ایک طرح کی مسرت ہوئی تھیں۔

اور یہ خیال انہیں مطمئن بھی کر رہا تھا کہ۔ فہد کو کون سا دکھی ہوتا تھا۔ وہ بے پروا سا لڑکا تھا اسے اس سے سروکار نہ تھا کہ اس کی شادی عینیہ سے ہوتی ہے یا کسی اور لڑکی سے۔ جبکہ وہ عمر کو پسند کرتی تھی تو اسے اس کا جواز حق ملنا چاہئے۔ انہوں نے بھی شمرہ کو اس رخ پر سمجھانا چاہا تو وہ ہنستے سے اکھڑ گئی۔

”آپ جانتی ہیں اماں۔ کہ یہ مرکز بھی نہیں ہو سکتا۔“ میری دس بیٹیاں بھی ہوتیں

تب بھی میں عمر سے ایک بھی نہ بڑھتی۔“

جواباً اماں اسے دل گرفتہ سی لگا ہوں سے دیکھنے لگیں ان کے اندر ایک گہرا دکھ اتر گیا۔ انہوں نے کچھ بولنا چاہا تو مٹرہ نے تلخی سے ان کو روک دیا۔

”برائے مہربانی۔ مجھے کسی قسم کی نصیحت مت کیجئے گا۔ نہیں سنا مجھے کچھ بھی کوئی نصیحت واعظ وہ عینہ پر ایک غصیلی نگاہ ڈال کر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

عینہ نے اماں جان کی طرف دیکھا پھر ادرے چارگی آمیز کرب سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”امی اتنی سنگدل تو کبھی نہیں تھیں نانو۔“ وہ بولے سے سسک پڑی۔

”انہوں نے آج تک مجھے کبھی نہیں ڈانٹا میری ہر ضد پوری کی ہے۔ بلکہ میری طلب سے پہلے میری خواہش کو پورا کیا ہے۔ مگر اب وہ اس معاملے میں اتنی سنگ دل اور خالم کیوں بن رہی ہیں۔“

”تو آج تو ہی اس کی بات مان لے۔ اس کی خواہش پوری کر دے بیٹی۔“ اماں جان نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اذیت سے اوروڑنے لگی۔

”نہیں نانو۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ میں خود کو ادرہ فید کو عمر بھر دھوکے میں نہیں رکھ سکتی۔

کیا آپ بھی چاہیں گی کہ میں ساری عمر کڑھتی رہوں۔ فہدی پر غلوں بے غرض بے لوث محبت کے جواب میں اسے جھوٹی محبت دوں۔ کھوکھلی اور بے روح محبت دوں۔“

اماں جان اس کا چہرہ بکتی رہ گئیں۔ تب وہ ان کی گود میں سر ڈال کر دھیرے سے

بولی۔

”نانو امی سے کہئے وہ مجھ سے میری زندگی کی ہر خوشی چھین لیں۔ مگر مجھے صرف

اور صرف عمر دے دیں۔“

وہ بولیں بولی جیسے کوئی بچہ اپنے من پسند کھلونے کیلئے بچل رہا ہو۔ اسے طلب کر رہا ہو۔

”پھل اتنا چاہتی ہے اسے۔“ ان کا ہاتھ اس کے سر کے ریشمی بالوں میں اٹک گیا۔

وہ سر ہلانے لگی۔

”ایسا کیا ہے اس میں؟“ وہ دھیرے سے بولیں۔ ان کی آواز جیسی تھی۔ جیسے کہیں بہت دور سے آرہی ہو۔ اور نگاہیں کہیں خلاء میں مرکوز ہو گئیں۔

”پتا نہیں یہ سوال تو میں نے خود سے کئی بار کیا ہے نانو۔ اور جواب پتا ہے کیا آتا ہے۔“

”کیا؟ اماں جان نے بے اختیار اس کے اٹھے ہوئے سر کی طرف دیکھا۔ تو وہ روئی روئی آنکھوں اور دل کی افرودگی کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ان میں کوئی ایسا سحر ہے جو مجھے میرے دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کوئی مقناطیسی کشش ہے جو مجھے لوہا بنا کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے میں نہیں جانتی۔ یہ کب اور کیسے ہو گیا۔“

اماں جان کے سینے میں سانس یوں خارج ہو گئی جیسے یہ سانس انہوں نے کب سے روک رکھی ہو۔ اور بڑی مشکل سے رکاوٹیں توڑ کر باہر نکلی ہو۔

”ہاں! بالکل اپنی ماں کی طرح اس میں بھی ایسا کوئی سحر ہے جو جکڑ لیتا ہے مقابل کو۔“

”نانو“ وہ ان کا کندھا ہلانے لگی تو وہ چونکی پھر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے

پیا لے میں لیتے ہوئے بولیں۔

”چلو اٹھو۔ نماز پڑھو۔ خدا بہتر کرے گا۔“

”ثمرہ اپنی ضد پر قائم تھیں اور وہ اپنی بھوک ہڑتال پر مگر دو دن کی بھوک ہڑتال نے ہی اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ بستر سے الگ گئی تھی۔ اس میں اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک نوالہ کھانے کو تیار نہ تھی۔



تیمور ولا۔ میں سب کے کانوں میں یہ خبر پہنچ چکی تھی مگر وہ شرم نے فون پر روتے ہوئے اطلاع دی تھی اور وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ذہن کے پردوں پر وہ سارے منظر فلم کی طرف چلنے لگے۔ جب عینیہ تیمور ولا میں آ کر عمر کے کمرے کی طرف دوڑ لگاتی۔ وہ لان میں ہوتا تو وہ لان میں نظر آتی۔ ہر خیز پہلے اسے سنانے بھاگتی۔ گھنٹوں اس کے کمرے میں گزاردیتی۔

پتا نہیں اس وقت انہوں نے غور کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ فون سننے کے بعد وہیں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ بالکل چپ، مگمگ۔

جیسے اب نہ کچھ کہنے کو رہا ہونا سننے کو۔

انہیں لگا جیسے عمر نے نہیں ”شہلا“ نے اسے ایک بار پھر شکست دے دی ہو۔

ان کا رواں رواں جملے لگا۔ اضطراب کی اہریں اندر سے اٹھ کر اندر ہی دم توڑنے لگیں۔ فہد کے مقابلے میں عمر کتنا عام سا تھا۔

”خدا جانے یہ عام سے لوگ دلوں پر کس طرح حکومت کر لیتے ہیں انہیں ایسا کن سا ہنر آتا ہے دل موہ لینے کا۔“

وہ انھیں اور لاؤنج کی دیوار پر لگے خوبصورت گولڈن فریم میں جڑے آئینے میں

اپنا چہرہ دیکھنے لگیں۔

گوری رنگت، جیسے نین نقش، ارد گرد بکھری ریشمی بالوں کی لٹیں۔ وہ آج بھی اتنی خوبصورت تھیں۔

یکدم آجینے میں نظر آتے اپنے بکس کے ساتھ دوسرا بکس ابھرا یا۔

بے حد عام سا مگر وہ جی مسکراہٹ سے سجا۔ یہ مسکراہٹ سراسر فاقہ بازی محسوس ہونے لگی۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں میچ لیں اور رخ موڑ لیا۔

دلوں کی جھگڑاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں

یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے پہلے

اس کے اندر سے ایک ہوک اٹھی، اسے یاد تھا وہ اس شعر پر ایک روز کتنا ہنسی تھیں جب شمرہ نے سنایا تھا اور ہنستے ہوئے اس نے وہ تصویر اٹھائی جو شمرہ اسے دکھانے لائی تھی۔

”یہ..... یہ چہرے دلوں کی بستیاں تاراج کر سکتے ہیں۔ ایسے چہرے حادث آجوک وہ پھر کھلکھلائی۔

”تیمور۔ اس لڑکی سے شادی کر لے گا۔ ہا۔ اس۔ اس لڑکی سے۔ بھلا دیکھو اس

میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے نہ رنگ نہ روپ، اف۔ کیوں مذاق کر رہی ہو شمرہ۔ اب تمہارے حسین خور و بھائی کا میٹ اتنا یوگس نہیں بھی ہو سکتا، کہ اس شکل کو مجھ پر فوقیت

دے۔“ وہ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔ اتنا پانی کہ سارے الفاظ بہہ گئے۔ پھر کچھ نہ رہا تھا کہنے کو۔

مئی۔ فہد کی آواز عقب سے ابھری تو وہ گہری سانس بھر کر بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پلٹیں۔

”مئی۔“ آپ ہی شمرہ چھو پو تو سمجھائیے نا، بے کاری ضد لے کر بیٹھی ہیں۔ مینیجر کی

حالت دیکھی ہے آپ نے“ وہ تاسف اور اچھے انداز میں شمن کو دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”بچپن کے رشتوں ناطوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی مئی۔ کیوں اس بچاری کو پابند کر رہے ہیں آپ لوگ۔ جب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور جبکہ عینہ اپنی پسند بھی بتا چکی ہے تو عینہ اسے اس کا جائز حق ضرور ملنا چاہئے۔ یقین کریں مئی۔ میں بالکل بھی ان ایزی فیل نہیں کر رہا۔ بلکہ بے حد خوش ہوں۔ ویسے مزے کی بات ہے“ وہ گھوم کر ٹیبل پر سجے شوخیں پر انگلیاں مارتے ہوئے شرابی انداز میں ابرو کو جنبش دیکر مسکرایا۔ عینہ اور عمر کی جوڑی گلے کی شاندار اور دادو کی بھی دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔ عمر کو کھونٹے سے باندھنے کی۔“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

”بول چکے تم۔“ شمن جو کب سے غصہ ضبط کر رہی تھی آخر کار چنچ پڑی۔
 فہد نے ذرا سا چونک کر ان کا تپا تپا چہرہ دیکھا۔ کچھ کہنے کو لب کھولے کے وہ پھنکارے ہوئی بولیں۔

”ابھی تم سے کسی نے مشورہ نہیں مانگا ہے تم اپنے کام سے کام رکھو یہ فیصلے ہم بڑوں کے کرنے کے ہیں کیا بہتر ہے اور کیا نہیں ہم زیادہ سمجھتے ہیں۔“ وہ اس پر ایک غصیلی نگاہ ڈال کر لاؤنج سے نکل گئیں۔

”ممما بلیر بات تو سنیں بے شک فیصلے بڑوں کے کرنے کے ہیں مگر جنکی زندگی کے بارے میں ہو رہے ہیں ان سے تو کم از کم پوچھ لیں۔ شادی کوئی کھیل تو نہیں ہے ممما۔“ وہ ان کے پیچھے بھاگا۔

”جب ہو جاؤ فہد۔ خاکے لئے چپ ہو جاؤ۔“ وہ زور سے چلائیں انہیں لگ رہا تھا کپٹیوں پر رگوں کی بجائے لوہے کی تخت تاروں کا جال چبھ گیا ہو۔ وہ اپنے بیدروم میں گئیں اور دروازہ دھماڑے سے بند کر گیا۔



گھر میں عجیب سا ماحول ہو گیا تھا۔ یوں لگتا ہر کوئی دوسرے سے کھنچی کھنچا ہے۔
 فہد بھی اس دن کی ڈانٹ کے بعد اس معاملے سے لاتعلقی بن کر بیٹھ گیا تھا۔
 عمر کی گہری خاموشی اپنی جگہ تھی۔ تاہم وہ معمول کے مطابق سب میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔
 اس دن تیوڈ شمرہ کے پاس آئے تھے۔ عینہ کی خبریت دریافت کرنے اور اسے

دیکھ کر انہیں ذہنی جھٹکا لگا تھا۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اس نے؟“ وہ فریج سے کولڈ ڈرنک نکال رہی تھیں۔

”یہ تو آپ اسی سے پوچھیے۔“

”کیوں؟ اس سے کیوں تم سے ہی کیوں نہ پوچھوں؟ اسے اس حال میں پہچاننے کی ذمہ دادر تم۔“

”کیا... میں؟“ وہ کولڈ ڈرنک کی بوتل ڈانٹنگ ٹیبل پر پٹخ کر حیرت اور دکھ سے بولی۔

”خدا اس نے پڑھ رکھی ہے، مورد الزام تجھے تھمر رہے ہیں آپ۔“

تیوڈ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ انہوں نے اس کی پیش کی ہوئی بوتل کو ایک طرف رکھ دیا اور ٹیبلے لگے۔

”بجائے اسے سمجھانے کے آپ مجھے ملیم کر رہے ہیں۔“

”تو کیا خرابی ہے عمر میں کر تم اسے رو کر رہی ہو۔“ انہوں نے رک کر بڑی تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ لحظہ بھر وہ چپ ہو کر سر جھکا گئیں۔ مگر وہ ہنوز اسے ایسی ہی تیکھی اور گرم نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”کیا وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ ان پڑھنے جاہل بنے بے روزگار بنے مگڑا ہوا اوباش ہے۔ معذور ہے بد کردار بنے بناؤ کیا خرابی ہے اس میں؟“

”تیوڈ۔“

”چپ ہو جاؤ۔... کچھ نہیں سننا چاہتا میں۔ تمہاری لنگڑی لولی دلیل۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”کیسی ماں ہو تم۔ بیٹی بستر سے لگ گئی ہے اور تم نفرت میں اندھی ہو بیٹھی ہو۔ تمہارے اور شمن کے سینوں میں بھری کدورتوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ تم دونوں کو نفرت کے جذبے نے بے اوسان کر دیا ہے۔ شمرہ تمہیں۔ تمہیں اپنا خون اپنا سگا بھتیجا نظر نہیں آتا۔ صرف اس کی ماں کا نکس دکھائی دیتا ہے۔ اپنی بیٹی نظر نہیں آتی اس کی خوشیاں دکھائی نہیں دیتیں ماضی کی اس بے قصور عورت سے نفرت نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ خود غرض بناؤ والا ہے جسے ظالم بنادیا ہے مگر سن لو آج اور یاد رکھو۔ اگر عینہ کی شادی

عمر سے نہیں ہو سکتی تو پھر فہد سے بھی نہیں۔ اگر یعنی بہو بن کر آئے گی میرے گھر میں تو صرف اور صرف عمر کی بیوی کی حیثیت سے اور کسی حیثیت سے نہیں۔ یہ فیصلہ میں عینہ کی حالت کے پیش نظر اور عمر کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلانی کے پیش نظر بھی کر رہا ہوں۔ آگے تمہاری مرضی، میری طرف سے اجازت ہے جہاں اور جس کے ساتھ چاہو اپنی بیٹی بیاباہ

”وہ اپنا آخری فیصلہ بے لچک لچک میں بنا کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”تیسو... تیسو بھائی۔ بات تو سنیں۔“ ثمرہ دوڑ کر ان کے پیچھے لگی تھی۔

وہ رک تو مجھے مگر پلٹے نہیں۔ آنکھوں کی تہوں میں غصہ اٹھ رہا تھا۔ پیشانی پر لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔

ثمرہ کی ساری ہمتیں جھاک کی طرح بیٹھ گئیں۔ وہ تیسو کی ضد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ فیصلہ کر کے بدلے نہیں تھے۔

اور اب عمر سے عینہ کی شادی نہ کرنا مطلب ہوتا ہمیشہ کے لئے اس گھر سے تعلق ٹوٹ جانا۔

ان کے دل پر پتھر آ پڑا۔ وہ بھائی کے پتھریلے چہرے پر نگاہ ڈال کر پھر چہرہ جھکا کر تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔

”آپ عمر سے پوچھ لیجئے گا۔ مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔“

تیسو جھکے سے پلٹے تھے۔ پہلے تو بہن کو فورے دیکھتے رہے پھر گہری سانس بھر کر ایک ہنکار ابھر کر سر ہلانے لگے۔ ان کی چہرے کے تنے زاویوں کی غٹائیں یکدم ڈھیلی پڑ گئیں۔

”مجھے تمہارے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ میں جلد عمر سے بات کرتا ہوں۔“ پھر

اپنا تیت بھری نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ”عینہ میری بہو نہیں بیٹی بن کر آئے گی۔ وہ عمر کی بیوی بن کر جتنی خوش رہے گی اتنی فہد کی نہیں۔ اس کی میں ضمانت دیتا ہوں۔ تم سچائی کی آنکھ سے دیکھو تو خود میری بات کی تائید کر دو گی۔“

وہ چلے گئے۔ ثمرہ کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح، جہیں رکھی کر سی پر بیٹھ گئی۔

ادھر کھڑکی سے لگی عینہ کو اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔

تیسو کی آواز خوشبو بن کر اس کی سامتوں سے نکل آئی تھی۔

اسے ماں کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ عمر کے لئے رضا مندی دے رہی تھیں۔ اس نے تیسو کو خوشی سے پلٹتے ہوئے دیکھا۔ پھر ثمرہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور اسے لگا جیسے اس کے اندر کسی نے نئی روح پھونک دی ہو۔ اس کی بکھری آواز انیاں یکدم سٹ آئی ہوں..... تمام تر کمزوری زائل ہو گئی ہو اور وہ پھر سے چاک وچو بند ہو گئی ہو۔

خوشی کا احساس مقوی کھانوں سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے اسے آج بتا چلا۔ محبوب سے ملنے کا خیال۔ آئرن کی ٹیبلٹ سے کہیں زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ اسے آج محسوس ہوا۔

وہ آج تین دن کی بھوک ہڑتال کے بعد رات کا کھانا پاپا کے ساتھ مل کر کھا رہی تھی۔ پاپا کی سرست آتیمیز رنگی پر ثمرہ نے انہیں مختصر آتیا بتاتا ہوا دیکھا کہ ان کا چہرہ بڑا بے روق سا تھا۔ ان کے چہرے کے زاویوں میں خوشی کی رشت تھی نہ تا گواریت کا رنگ۔

سپاٹ بے تاثر چہرہ تھا۔

مگر عینہ اپنی خوشی میں گن ماں کا چہرہ کہاں دیکھ رہی تھی۔

رات کھانے کے بعد اس نے امین کو فون کر کے یہ خوش خبری سنائی تو امین نے

بھول جاؤ۔“

”مس ایمن علوی، جسے واپس پلٹنا ہی نہ ہو وہ کیونکر واپسی کا راستہ یاد رکھے گا۔“
وہ دھیرے سے بولی تھی پھر۔ یکدم جیسے ماحول کی سنجیدگی کو کاٹنے کی غرض سے بولی۔

یہ کہاں کی دقتی ہے کہ بننے ہیں دوست نا صبح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
ایمن بی بی خدا را تم یہ نا صبح کا رول پلے کرتی۔“
وہ ہم مزاجیہ انداز میں ہنسی ہو کر بولی تھی۔

پھر وہ دونوں کتنی دیر اوت پٹاٹنگ باتوں میں ہنسی رہیں۔ وہ یکدم ہی ہلکی پھلکی
گئی تھیں۔ ہنسی خود بخود دلوں سے آزاد ہو کر فضا میں سازه کی طرح بکھر جاتی۔

شمرہ اس کے کمرے کے باہر گزرتے ہوئے ٹھٹھک کر رہی تھیں۔ اس کی ہنسی کی
جھنکاریں اس کے دل پر یک ناموودہ سا احساس رقم کر رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر کھڑی اس کی ہنسی کی یہ مدھر جھنکاریں سنتی رہیں پھر لبوں کو دانتوں میں
دبا کر جوہل جوہل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف ہوئیں۔

رات بھر وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہیں۔

کبھی بی بی کی ہنسی کانوں میں بجنے لگتی۔ کبھی عمر کا سراپا لہر اجاتا۔

کبھی شبنم کی شکوہ کنائیں نگاہیں تو کبھی تیمور کا غصہ یاد آنے لگتا۔

صبح بھی بے چینی ختم نہ ہوئی تو وہ تیمور دلا جلی آئیں۔

شن اماں ہان کے کمرے سے نکل رہی تھیں۔

شمرہ کو دیکھ کر اس کی نظروں میں خود بخود شکوے چل اٹھے۔ اور شمرہ کچھ چھینپ

کر اس کی نظروں سے نگاہیں کتر اکراماں جان کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

بھی خوشی کا اظہار کیا پھر اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

”آئی تیار رہی تھیں تم بستر مرگ پر فائدہ کشی سے چور چور اور ادھر میں تو اب
انتظار کر رہی تھی کہ تم اپنے انتقال پر ہلال کی خبر سناؤ گی۔“

اس نے ریسور کو گھورا جیسے وہ ایمن علوی ہو۔ پھر مصنوعی غٹکی سے بولی۔

”اور تم نے یقیناً سوئم کے لئے لباس بھی تیار کر دیا ہو گا۔ ہے نا۔“

”آف کورس... نہ صرف سوئم کے لئے بلکہ چہلم کے لئے بھی سوچ رہی تھی لہذا

وغیرہ بنواؤں۔ آخر تمہاری بیسٹ فرینڈ ہوں۔“

”بے ہودہ... بے مروت اور طوطا چشم لڑکی۔ افسوس کہ تمہاری یہ دلی آرزو پوری

نہ ہو سکی مگر افسوس مت کرو یہ لہذا تم میری غٹکی والے دن پہن لینا۔“

اور جواباً ایمن کا چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ ریسور میں گونج اٹھا۔

”ویسے چالاک لڑکی۔ کہیں یہ ڈراما اس لئے تو نہیں رچا رہی تھیں کہ۔“

اپنے مر جانے کی افواہیں اڑا کر

اس کو اپنے گھر بلانا چاہتے تھے

اور جواباً عینہ نے ایک سر قسم کی آہ کھینچی۔

”ارے کہاں ایسی قسمت....“

”بڑا ہی تیز را رہی ہو۔ ویسے عینہ۔ یہ دیوانگی اچھی چیز نہیں ہے۔“ وہ بکدم

سنجیدگی کی لپیٹ میں آتے ہوئے ناصحانہ انداز میں گویا ہوئی۔

”مجھے کبھی کبھی بڑا ہی خوف آتا ہے تیری اس دیوانگی سے۔“

”ارے۔ تمہیں کیوں خوف آتا ہے بھلا؟“ وہ زور سے نفس پڑی۔

”اس لئے کہ محبت یوں نہیں اچھی۔ اسے بنوں نہیں بناتے عینہ۔ یہ جنوں

کراس کی نظروں سے نگاہیں کتر اکراماں جان کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

پتا نہیں تینور نے گھروالوں کو کچھ بتایا بھی تھا یا نہیں یا وہ پہلے عمر سے بات کرنا چاہتا

تھا۔

مگر ثمن کی نگاہوں کا شکوہ تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا کہ اس کے علم میں آ چکا ہے اور وہ سارا وقت ثمن سے نظریں ہی نہ ملا پارہی تھیں۔ ثمن کی خاموشی بھی بڑی سرگرمی تھی۔ اس نے ملازمہ کے ہاتھوں اسے چائے بھجوا دی اور خود وہ پھر کا کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی مگر جب شمرہ کی بے چینی حد سے سوا ہو گئی تو وہ خود ہی ثمن کے پاس چلی آئی وہ اپنے بیڈ روم میں تھیں۔ تنیکہ کا غلاف بدل رہی تھیں۔ شمرہ کو دیکھا مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے شمرہ! مجھے تینور نے بتا دیا ہے کہ یہ خالص ان کا فیصلہ ہے۔“

شمرہ ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر دیوار سے لگ کر ثمن کو دیکھنے لگی۔

جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو مگر کچھ بھی نہ کہہ پارہی ہو۔ کوئی لفظ گرفت میں نہ آ پا

رہا ہو۔

”مجھے تینور اور عینہ نے مل کر توڑ دیا ثمن۔ ورنہ میں کبھی ایسا نہ ہونے دیتی۔ تم شکوے کرنے میں حق بجانب ہو۔ مگر خدا را میری مجبوری بھی کبھی نہیں ہے۔ میں نے مانا ہو کر کس طرح تین دن تک سینے پر پتھر رکھا تھا ثمن..... عینہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی..... مگر میں نے صرف اور صرف اس لئے برداشت کیا کہ۔“

”میں نے کہا تھا مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے۔ بس ان تقدیر سے ہے۔“

اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ شمرہ نے چوری نظریں اس پر ڈالیں پھر آنکھیں ایک

دو لمحے کے لئے موند کر کھولیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں کبھی ایسا چاہ سکتی ہوں۔“

وہ ثمن کو دیکھنے لگیں جبکہ ثمن کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے

میلی چادر اور غلاف کا رول بنا کر ایک طرف پھینکا اور الماری سے چلی ہوئی بیڈ شیٹ نکالنے ہوئے بولیں۔

”تمہارے نہ چاہنے یا چاہنے سے کبھی کچھ ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی....

چھبیس سال پہلے بھی یہی جو ہوا۔ ایسا تم نہیں چاہتی تھیں مگر ہو گیا تھا۔“

شمرہ کے دل پر زبردست چوٹ پڑی۔ اس کی ہلکیں جھک گئیں۔ پھر وہ اضطرابی انداز میں انگلیاں مسلنے لگی۔ وہی مانوس سی آگ بھڑکنے لگی۔ ساری رات اس نے اس آگ کو ٹھنڈا کرنے میں گزاری تھی۔

عینہ کی ہنسی کی پھوار نے ان شعلوں کو بجھانے کی کوشش کی تھی۔ ثمن نے پھر ان شعلوں میں تیل چھڑک دیا تھا۔

وہ اضطراب اور دل پر بوجھ سینے کمرے سے نکل گئیں۔ راہداری سے گزرتے

ہوئے عمر کے کمرے کے پاس اس بھر پھر اس پھر ہونٹ بھینچ کر لاؤنج میں چلی آئیں۔

رات کے کھانے پر تینور اور عمر بھی موجود تھے۔ وہ اماں جان کے کمرے سے باہر

آئیں تو میز پر انہی کا انتظار ہو رہا تھا۔ تینور شمرہ کو کچھ خوش دلی سے بولے۔

”آؤ..... آؤ شمرہ..... کیسی ہو؟ عینہ نہیں آئی ساتھ۔“

اس نے سرگونی میں ہلا کر کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے یونہی نظر بھر کر عمر کو دیکھا۔ ہلکے

گرے رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا اونچا لمبا سر لپا خاصا جاذب نظر دکھائی

دے رہا تھا۔

اس کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔

کوئی ایسی خوبی تھی اس میں جو اس کی شخصیت میں ایک سحر پیدا کر رہی تھی۔ اور وہی سحر نے عینیہ کو جکڑ لیا تھا

وہ آج شاید ایک بڑے عرصے بعد اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

پھر ایک گہری سانس بھر کر اپنی پلیٹ پر جھک گئیں اور چپ چاپ کھانے لگیں۔

”عمر تمہیں عینیہ کیسے لگتی ہے؟“ کئی لمحے کی خاموشی کے بعد تیمور کی آواز ابھری

تھی۔ وہ عمر سے مخاطب تھے۔ عمر نے حیرت سے سر اٹھایا تھا جبکہ شمرہ کو اپنے حلق میں نوالہ پھینکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھایا اور یوں سے نگالیا تھا۔

”بس ایک سوال ہے جو چاہا وہ جواب دو۔“ تیمور یہ کہہ کر ہنس دیے۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔ اور بولا ”اچھی خاصی ہے“

”اچھی خاصی نہیں بہت اچھی لڑکی ہے اور میں اس کا رشتہ تم سے کرنا چاہتا

ہوں۔“ تیمور اس کی بات کے جواب میں بولے تھے۔ لہجہ بھر کے لئے میز پر مکمل خاموشی چھا

گئی۔ پھر شمرن اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ شمرہ بھی بس اپنے نوالے سے ہی کھیل رہی تھیں۔

عمر نے البتہ بے حد اطمینان سے سر اٹھا کر باب کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچانک آپ کو یہ خیال کیونکر آ گیا۔ جبکہ میں تو سن رہا تھا کہ اس کی

شادی.....؟“ اس نے دانستہ جملہ پورا نہ کیا۔

”دیکھو عمر۔ شادی میرے نزدیک کوئی کھیل نہیں ہے۔ جب تک دونوں فریقین

راضی نہ ہوں دل سے وہ میرے نزدیک شادی نہیں، محض سمجھوتہ ہوتا ہے اور سمجھوتے میں

خوشیاں نہیں ملتیں۔ امنگیں اور دلوں کو توڑ جاتے ہیں۔ حقیقی سرتیں گم ہو جاتیں ہیں۔

شادی کو ہمارے یہاں واقعی جوابنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ جبکہ میں اسے ایک خوبصورت اور سر

ت انگیز اور پائیدار زنجیر سمجھتا ہوں جو دونوں فریقوں کو باہم ایک دوسرے کی محبت میں جکڑ کر زندگی کو مکمل کرتی ہے۔“ وہ ایک دو لمحے کے توقف کے بعد پھر بولے۔

”عینیہ دراصل تمہیں پسند کرتی ہے اور اگر اس کا ذہن تمہیں قبول کر رہا ہے تو یہ

اتنی معیوب بات بھی نہیں ہے۔ اس لئے میں اس کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ فہد کی فکر

مجھے اس لئے نہیں ہے کہ وہ بالکل غیر جانبدار ہے۔ اس نے ابھی تک ذہن میں کوئی خاکہ

نہیں بنایا تھا۔“ تیمور اتنا کہہ کر چپ ہو کر اڑسا کہ چہرہ ہلکنے لگے بلکہ میز پر موجود ہر کسی کی

نظرس اس پر تھیں۔

وہ پلیٹ میں موجود کباب پر کچھ دیر تو کاٹنا مارتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس بھر کر

ہلکے سے مسکرایا تھا۔ یوں جیسے بڑے عرصے کے بعد کندھے پر رکھے ہوئے کھجور کو اتارنے کا وقت

آیا ہو۔

بڑے دنوں بعد کوئی خوشی دل سے اتر کر روح میں پھیل گئی ہو اور اب ہی مسکرانے کا

وقت آیا ہو، یقیناً محبت بڑا اچھا جذبہ ہے۔ یہ سلاب کی طرح حملہ آور ہوتا ہے اور اپنے

سامنے کی دیوار کسی رکاوٹ کو نہیں دیکھتا..... بلکہ اسے بھی تو ذکر بہا کر لے جاتا ہے۔ ایسا ہی

عینیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بے خبر نہیں تھا۔ اس کی تین دن کی اس بھوک ہڑتال۔ اس کی

بیاری سے..... ہاں بس مختصر تھا کہ کب یہ فاقہ مستی رنگ لاتی ہے کہ اس کی

دیوانگی مضبوط دیوار کو توڑتی ہے۔

اس نے شمرہ کی طرف ڈرامائی نگاہ کی۔ پھر تیمور کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے

نہرے لہجے میں بولا۔

”آپ کی باتیں اپنی جگہ بالکل بجا ہیں۔ شادی واقعی باہمی رضامندی سے ہونی

چاہئے مگر مجھے افسوس ہے کہ یہ صرف عینیہ کی اپنی خواہش ہے میری نہیں۔“

اس کا خیال تھا اس نے یہ کہہ کر میز پر نہ سہی شمرہ کے دل پر ضرور دھما کر کیا ہے اور اس کا خیال درست ہی تھا۔ شمرہ تھرا آ میز بے یقینی کے ساتھ اسے سنبھال رہی تھیں۔

”میں بھی سمجھوتے کا قائل نہیں ہوں پاپا..... بہر حال ہر شخص کو پسند کرنے کا حق حاصل ہے وہ اگر مجھے پسند کرتی ہے اور اتنی شدتوں سے تو..... یہ اس کا پاگل پن ہے یا واقعی جذبات بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر میں اس کے لئے ایسے کوئی جذبات نہیں رکھتا۔“

اس کا لہجہ ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔

پھر وہ شمرہ کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے بہت دکھ ہوا کہ آپ نے اس کی تربیت میں کوتاہی کر دی۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر تعلیم پر توجہ دینے کی تھی۔ اتنی چھوٹی اور معصوم عمر تو ماں باپ کے فیصلے پر سر جھکانے کی ہوتی ہے تاکہ سرکشی کی۔“

اس کے لبوں کی تراش میں پھلی مسکراہٹ کچھ سنگینی سی استہزائیہ آ میز ہو کر لبوں پر نمودار ہو گئی۔ وہ اس دھیسے لب دیکھنے میں بولا۔

”اس عمر میں بھڑکنی آگ کی چمکتی لائٹوں کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ جسے چھونے کی خواہش پھیل جاتی ہے مگر وہ آگ کو چھونے کے بعد کی سیاہ کاریوں سے بے خبر ہوتی ہے مگر آپ تو سمجھدار اور میچورڈ تھیں شمرہ پچھو آپ تو اس آگ کی تباہ کاری سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسے باز رکھ سکتی تھیں۔“

وہ کہہ کر اسی اطمینان سے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔



عمر تیسویں نے لفظوں کے جو طمانچے مارے تھے اس کی اذیت شمرہ اپنے دل کے رخسار پر کتنی ہی دیر تک محسوس کرتی رہی۔ انہیں اپنے اعصاب مل ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ جیسے اب وہ اس کرسی سے کبھی نہ اٹھ سکیں گی۔ یونین پتھر کی سل کی طرح پڑی رہیں گی۔

خفت اور بیکاسی احساس اس قدر شدید تھا کہ سر اٹھا کر اس کے خوشی سے دیکھنے سرخ چہرے کی طرف دیکھ بھی نہ پائیں۔

اور رات گئے جب خود کو گھسیٹت ہوئی گھر لوٹیں تو انہیں لگا جیسے وہ لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہوں۔ خود اپنے حیرتوں سے چلتی ہوئی آئی ہوں۔

ٹوٹے پھوٹے راستوں پر دوڑتی ہوئی
خارزار جھاڑیوں سے الجھتی ہوئی۔

ایک ایک انگ شدت سے دکھ رہا تھا۔ مگر اس کی اذیت صرف ان کا دل محسوس کر رہا تھا۔ تکلیف کا احساس جسم پر نہیں روح پر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تو دہرے صدمے سے گزر رہی تھیں۔

ایک اپنی شکست کا زخم۔
اپنی سبکی کا احساس ان سوراخوں پر تھا دوسرا سبکی کے خوابوں کے بکھرنے کا۔
اس کی خوشی کا بننا گھر وندہ یک دم نوٹے کا ملال۔

مگر یہ ملال انہیں کیوں کر ہوا۔ وہ حیران ہو گئیں۔ انہیں تو خوش ہونا چاہئے تھا۔ وہ کاٹنا خود ہی نکل گیا تھا درمیان سے۔

عمر نے خود ہی اس کا رشتہ مسترد کر دیا تھا۔

تیو کی بات رد کر دی تھی۔ فہم کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا اور یہی تو وہ چاہتی تھیں۔ اسی تک وہ دو میں تو تھیں۔

مگر اب ایسی چوٹ کیوں گئی تھی کہ تکلیف کا احساس خون بن کر رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

ہاں مگر شاید اس طرح نہیں چاہا تھا۔

یوں تذلیل کے احساس کے ساتھ۔

وہ چپکے چپکے سارے آنسو ہوا کر بٹی کے پاس چلی آئیں۔

وہ جانتی تھیں اس کے کان کوئی خوش خبری سننے کے منتظر ہوں گے۔ مگر اب جبہ

کران کے پاس ایسی کوئی خوش خبری نہ تھی کہ وہ اسے اور کیسے بہلا دے سکتی تھیں۔

انہوں نے عمر کی طرف سے کیا ہوا انکار اس کے گوش گزار کر دیا۔ یہ سن کر وہ کہتے ہیں کہ یہ کیفیت میں رہ گئی۔ ماں کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس بات کو جھوٹ یا مذاق پر ہرگز معمول

نہیں کر سکتی تھی۔

عمر نے خود انکار کر دیا اس سے شادی سے۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں پھر سکڑنے لگیں۔ اسے اپنے اعصاب اکڑتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ دوسرے پہلے وہ تیو را کر قالین پر ڈھیر ہو گئی۔

شمرہ کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ لپک کر اس کے نزدیک آئیں اور اسے بازوؤں میں بھر کر اس کے منہ پر ہلکے ہلکے تھپتھپارے لگیں۔ ساتھ ساتھ ملازمہ کو بھی آواز دیں دیئے لگیں۔

”زبیدہ.... زبیدہ۔“

زبیدہ جلدی سے احمر کو بلاؤ۔ ان کے پاپا کو بلاؤ۔ جانے میری بچی کو کیا ہو گیا۔“ وہ کمرے میں داخل ہوتی ملازمہ کو دیکھ کر چٹخیں تو وہ بدحواس الٹے پیروں واپس مڑ کر شمرہ کے بیذروم کی طرف بھاگ لی۔

پاپا (احمر) خود گھبرا گئے اور ڈاکٹر کو لینے دوڑ پڑے۔ چند گھنٹوں بعد اسے ہوش آ گیا تھا۔ اور ہوش میں آنے کے بعد وہ ہلکے ہلکے کر رہی تھیں۔ شمرہ سے سنہیل نہ رہی تھیں۔ پاپا ڈاکٹر کو چھوڑنے باہر تک گئے تھے۔

”یہ جھوٹ ہے امی۔ کہہ دیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ آپ سب لوگوں کے منہ لٹ کر۔ ورنہ عمر ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ... وہ مجھے کبھی رنجیت کر ہی نہیں سکتے۔“

”بھول جاؤ اسے۔ وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے وہ دھوکے باز جھوٹا مکار۔“ شمرہ اسے تھپتھپتے ہوئے نفرت سے بولیں اس نے بھیگی بھیگی آنکھیں زور سے میچ لیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

رہتا تھا۔

اور اس کی ڈائری میں لکھیں وہ خوب صورت چھوٹی چھوٹی نظمیں۔ اور پھر اسے پڑھنے دینا۔ کیا یہ سب اس کے جذباتوں کی پذیرائی نہیں تھی؟

یہ ڈھکا چھپا اظہار نہیں تو اور کیا تھا۔

وہ کیسے یقین کر لیتی کہ وہ ساری کی ساری محض اس کی غلط فہمیاں تھیں۔

اس نے بڑی بے بسی اور اضطراب سے نیکیے پر سر ہنچا۔

ابھی تو رات بدلتی تھی ابھی تو پھول کھلے تھے

ابھی تو رات ڈھلتی تھی ابھی تو دغ سنے تھے

ابھی تو سرزمین جاں پر ایک بادل کو گھر کر آتا تھا

ابھی تو وصل کی بارش میں نیلے پاؤں پھرنا تھا

ابھی تو کشت غم میں اک خوشی کا خواب بونا تھا

ابھی تو سیکڑوں سوچی ہوئی باتوں کو ہونا تھا

ابھی تو ساحلوں پہ منکب ابر بار چلتی تھی

نہ جانے رات کے کس پہرے سے نیند آگئی تھی۔ صبح آکھ کھلی تو پورا بدن آگ کی

طرح پھنک رہا تھا مگر باوجود اس کے ایک ہی ضد تھی وہ نانو کے پاس جانا چاہتی تھی۔

شرہ نے اس کی ضد اور کیفیت کے بیش نظر اہل جان کو فون کر دیا تھا۔ ان کا تو

خیال تھا کہ وہ یہ معاملہ خود ہی مینڈل کر لیں مگر اب نہیں جی کی گزرتی حالت نے خوف زدہ

سا کر دیا تھا۔

اماں تو فون پر عینہ کی بیماری کا سنتے ہی دوزی چلی آئیں اور جو اس کی حالت

دیکھی تو ان کا کلیجہ منہ کو آگیا انہوں نے لپک کر اسے ہانپوں میں بھر لیا۔ وہ بھی سارے

”نہیں امی۔ وہ دھوکے باز نہیں ہیں وہ جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ میں خود جاؤں گی وہاں۔“ آنکھیں کھول کر وہ اپنے جسم پر پڑی چادر دور پھینک کر شرہ کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے لے جائیں وہاں۔ میں نانو کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ پلیز امی! مجھے نانو کے پاس لے جائیں پلیز۔ لے جائیں نا۔“

”ہوش کرو عینہ۔ اتنی رات گئے وہاں کیسے جا سکتے ہیں۔ صبح نانو خود آئیں گی تمہارے پاس۔ میں خود انہیں لے کر آؤں گی بس! اب خود کو سنبھالو دیکھو تمہارے پاس پاپا بہت پریشان ہیں تمہارے لئے۔ تمہیں روتا دیکھیں گے تو ان کا دل بہت دکھے گا۔ بس کرو میری جان بس کرو۔“

وہ اس کا آنسوؤں سے بھیجا ہوا چہرہ پوچھنے لگیں۔ اس نے تھک کر نیکیے پر واپس سر رکھ دیا اور درد سے پھٹنے سر کو سنبھال دینے کے لئے آنکھیں موند لیں۔

مگر اب بھی اس کی آنکھوں سے لاوا چپکے چپکے بہتا رہا جیسے دل کے اندر کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔ وہ کیسے اس بات کا یقین کر لیتی کہ عمر نے اسے رد کر دیا ہے۔ کیا وہ اس کے جذباتوں سے نا آشنا تھا؟ مگر یہ کیسے ممکن تھا وہ تو خود اس کے جذباتوں کے چراغوں میں وقفے وقفے سے اپنے التفات کا تیل ڈالتا رہا تھا۔ وہ اس کی دیوائی سے اچھی طرح باخبر تھا۔

اور پھر اس کی وہ دل آویز باتیں

وہ دل موہ لینے والی لگاتیں

وہ دھیمبا جبکہ لہجہ

اور روح میں اتر جانے والے جملے۔ جس کی پھوار میں گا بے بگا ہے اسے بھگوتا

حوصلے ایک بار پھر بارگئی۔ نانو کے ہمدرد اور غم گسار بازوؤں میں بکھر بکھری گئی اور اتار دئی
اتار دئی کہ جیسے اب عمر بھر نہ رو سکے گی۔

نانو اسے تھک تھک کر سلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ دل دلی زبان میں شمرہ کو بھی برا
کہنے لگیں۔ اسے مورد الزام ٹھہرانے لگیں۔ شمرہ پر ملال انداز میں ہونٹ بھیجنے اس کے سر پر
خضفے پانی کی پٹیاں رکھتی جا رہی تھیں۔

”یہ سب تمہاری ضد کا نتیجہ ہے۔ صرف تمہاری بے جا ضد کا۔“ اماں کے اس
الزام پر اس کا ضبط جواب دے گیا۔

”میری ضد؟“ انہوں نے انتہائی شکایتی انداز میں ماں کو دیکھا پھر نفرت سے
بولیں۔ ”میری ضد یا عمر نے اپنی برسوں پرانی دشمنی نکالی ہے۔“

”خبردار۔ جو عمر کو کچھ کہا یا اس پر کوئی الزام رکھا۔“ اماں آتشیں ہو کر پھٹ پڑیں۔

”اس بچے پر الزام لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے کون سا اس سے محبت، شفقت کا
سلوک روا رکھا ہے۔ اپنی غلطیوں پر پردہ مت ڈالو۔ اس کے ساتھ تم نے اور دشمن نے
آج تک جو کچھ کیا ہے اگر وہ بدلے میں ایسا کرے تو بھی اس کا حق بننا ہے مگر وہ اس
معاملے سے قطعی لاتعلقی ہے اس نے یہ کسی انتقامی کارروائی کے تحت نہیں کیا، وہ تو یوں بھی
کسی سے بھی شادی کے حق میں نہیں تھا۔“

”جھوٹ بولتا ہے وہ۔ اس نے میری بچی کو دوغلا یا ہے۔“ شمرہ یک دم چلائی اور
ٹھنڈے پانی کا ڈونگا ہاتھ مار کر بینڈ سے نیچے گرا دیا اور خود بینڈ سے اتر کر کرسی پر جا کر بیٹھ کر
دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو نہ لگیں۔

کمرے میں یلکھت ملول فضا چھا گئی۔ اماں جان کے ساتھ عینیہ بھی انہیں بس
دیکھتی رہ گئی۔ کچھ دیر ان کی سسکیاں گونجتی رہیں پھر وہ دیر سے سے بولیں۔

”اس نے انتقام ہی لیا ہے مجھ سے۔ ہاں اماں اس نے انتقام لیا ہے۔“ وہ بے
بسی سے ہونٹ کانٹنے لگیں۔

”اسے انتقام لینا ہوتا تو بہت پہلے لے چکا ہوتا۔ وہ کیوں تمہارا اور دشمن کا احترام
کر تا رہا۔ محض مروت میں۔ اس کی رگوں میں دشمن کا نہیں شہلا کا خون دوڑ رہا ہے اس لئے
اس کے اندر مروت ہے۔“

اماں جان نے اس کی طرف سے رخ موز لیا۔ ان کا لہجہ اس قدر کڑوا تھا کہ شمرہ
کت کر رہ گئی۔ پھر جھٹکنے سے کرسی سے اٹھیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ادھر عینیہ اس انکشاف کے سے متحیر رہ گئی تھی کہ عمر دشمن کی نہیں، کسی شہلا کا
بیٹا ہے۔ اس نے شمرہ کو کمرے سے جاتے دیکھا پھر اسی حیرت آمیز نظروں سے نانو کا چہرہ
دیکھنے لگی، جن کی نظریں اس کی جانب اٹھیں تو اس میں چھلنے والی سوالات نے انہیں غلط بھر کو
نظریں چرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ دنگا بن گئیں اور اس کا سر ہو لے ہولے دبا نے لگیں۔
مگر اس نے ان کا وہ لرزتا ہاتھ اپنی پیشانی سے بنا کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور ان پر کڑوری
گرفت کرتے ہوئے لرزتی مرتعش آواز میں بولی۔

”نانو ایہ شہلا کون ہیں؟“ اس کے ایک سوال میں ہزار سوال چل رہے تھے۔
ایک خوف زدہ کڑک رہا تھا۔ تجرہ بھروسے لے رہا تھا۔

’عمر کی ماں۔‘ اماں جان کی آواز بے حد دھیمی تھیں۔ ان کی گردن جھکی ہوئی
تھی۔ پھر انہوں نے بیڑی پشت سے ٹیک لگائی۔

ان میں عینیہ کے چہرے پر دنگا ہیں ڈالنے کا یارا نہیں تھا۔ وہ بس اس کی آواز سن
رہی تھیں وہ کہہ رہی تھی۔

”مجھے وہ سب بتا دیں نانو۔ جو آج تک مجھ سے چھپا پائا گیا ہے۔ امی کی عمر سے

نفرت کی کیا وجہ ہے؟ جس کی پلیٹ میں میرے سارے خواب آ کر کھرنے لگے ہیں۔ بتائیں نا نا نو۔ آپ کو میری قسم۔ عمر کی قسم۔ ”وہ ان کا ہاتھ جھنجھوڑنے لگی۔

اس کے لہجے میں منت، ساجت تھی۔ اماں جان نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر اس کے سر پر نرمی سے رکھ دیا۔

”جب ہماری سوچ کے برخلاف کچھ ہو جاتا ہے۔ جب ہم کسی سے خود بخود برت سی تو قعات وابستہ کر لیتے ہیں اور جب وہ فوجی ہیں تو سوچ کا دھارا جذبات میں اتر مٹنی رخ کی طرف بہنے لگتا ہے۔ دل میں کھچاؤ سا پیدا ہوتا ہے اور اس کھچتی اور دل گرفتہ۔ مین میں جانے جیسے نفرت کا بیج پڑ جاتا ہے اگر اس بیج سے اگنے والے پودے کو اگتے ہی نہ کاٹ دیا جائے تو وہ تناور درخت بن جاتا ہے اور اگر اس کی مسلسل آبیاری کی جائے تو پھر وہ اس قدر گھنا دیز ہو جاتا ہے کہ اس کی شاخیں ادھر ادھر پھیل کر محبت کے پودے کے اگنے کے لئے جگہ نہیں رہنے دیتیں۔ اس کی جڑیں دل کی زمین پر دوردور تک پھیل کر ساری زمین کو خیر کر دیتی ہیں۔ بس پھر اس زمین پر نفرت کی خود رو جھاڑیاں ہی اگ سکتی ہیں اور نفرت کا جنگل وجود میں آ جاتا ہے جو اس زمین کے سینے کے ساتھ ارد گرد کی زمینوں کو بھی خنجر ہی کر سکتا ہے انہیں ٹھنڈا سا یا نہیں دے سکتا۔ انہیں صرف اندھیرا دے سکتا ہے۔ پھول اور خوشبو نہیں۔ ایسا ہی ایک جنگل شمرہ اور خن کے وجود میں آگ آیا ہے۔“

اماں جان کی آواز میں آنسوؤں کی نکل کھلی گئی اور باہر راہداری میں بے قراری سے غمگین شمرہ کے وجود میں یہی آگ کی بوندوں کی طرح خیب ٹپ کرنے لگی۔

وہ ایک کرب سیٹ کر لاؤنج کے صوفے پر جا کر گر سی گئیں۔ اس کی نرم پشت پر سر رکھ کر ملکتی آنکھوں کو زور سے سچ لیا۔

وہ کچھ نہیں سننا چاہتی تھیں۔

کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھیں۔

مگر

سو جیس خود رو پودوں کی طرح اطراف میں اگتی جا رہی تھیں۔

نگاہوں تلے وہ سب لہرا رہا تھا جو ماضی بن چکا تھا۔

”ہاں اماں جان۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں میرے اندر نفرت کا ایک جنگل اگ گیا ہے۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔ سوائے اندھیرے اور بد بو کے اس جنگل میں کچھ نہیں ہے۔

اسہوں نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔



”تمہیں۔ تمہیں۔ تیمور بھائی سے کتنی محبت ہے؟“ شمرہ نے کیسٹ پلیئر پر جھکی ٹخن سے یہ سوال بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ جس کے جواب میں خن نے یونہی کہنی کے بل لیے لیے صرف چہرہ موڑ کر اسے دیکھا پھر کیسٹ پلیئر میں ڈال کر کھٹ سے پلے کا مٹن پیش کر کے ہولے مسکرائی۔

”یہ اتنا بے ہودہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی تمہیں؟“

”بے ہودہ تو نہیں ہے۔ کیا تمہیں محبت نہیں ہے تیمور بھائی سے؟“ وہ اب بھی

تکلیف دہ سوال کر رہی تھی۔

خن پشت پر ادھر ادھر بکھر جانے والے بالوں کو سیٹ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”سوال تو بے ہودہ نہیں ہے مگر جواب بے ہودہ ہو سکتا ہے۔ یعنی وہی فلمی سا۔“

اس کے انداز میں شوٹی خن شمرہ ہنس پڑی۔

”چلو فلمی ہی سہی۔“

کیا مصیبت ہے۔ بھی تمہیں مجھے بٹھائے کیا دورہ پڑ گیا ہے کیا تمہیں پتا نہیں ہے کہ.....“ اس نے لب دانتوں میں دبالیے۔ ایک شرکین مسکراہٹ لبوں کو چھو گئی پھر اس نے نکلیہ اٹھا کر شرہ کو دے مارا۔

”بدتمیز لڑکی۔ بھلا میری محبت۔ میری بے تائیاں ڈھکی چھپی ہیں تم سے۔ ایک تم ہی تو ہو جو میرے اس پاگل پن سے واقف ہو۔“

تو محترمہ صرف میرے واقف ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ ایسے بھی واقف ہونا چاہئے۔“ شرہ زور سے ہنسی بھی وہ جھینپ نہی۔

”جتنے ہیں وہ۔ سب واقف ہیں۔ کیا سمجھتے نہیں ہیں کہ میں ممانی جان سے نہیں صرف ان سے ملنے آتی ہوں اور تم بھی تو ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہو۔ کیا وہ نا سمجھ ہیں۔ کم سن ہیں کہ نہ سمجھتے ہوں۔“

اور شرہ بہت کچھ کہنے کی خواہش اندر سی دبا کر چپ سی ہو گئی۔

یہ سچ تھا کہ شن کی یہ وارنٹگیاں محبت کی دیوانگیاں اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ وہ اس کی بھولی زادتی نہیں اس کی بہترین سہیلی بھی تھی۔

اسے خود بھی شن بے حد پسند تھی۔ اور اماں بھی شن کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ بس انتظار تھا کہ شرہ اور شن کا فاضل مکمل ہو جائے اور ادھر تیرہ بھئی تو ابھی مال مول کر رہا تھا۔ صبح کا ٹکڑا شام کو آتا۔ دو گھڑی ماں کے پاس بیٹھتا اور جو شاہی کا موضوع نکلتا تو بڑی خوب صورتی سے وامن بچا کر نکل جاتا۔ وامن یہ موضوع چھیڑتی ہی نہیں۔

مگر آج کل شرہ کچھ پریشان ہی تھیں۔ اسے تیمور میں کچھ تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ اس پرے تو پہلے بھی کرتا تھا مگر اب تو لکتا وہ خوشبوؤں میں نہا کر گھر سے نکلتا تھا۔ کپڑوں پر بھی خصوصی توجہ دینے لگا تھا۔ رات دیر تک جانے سے فون پر لمبی لمبی

گفتگو ہوتی۔ ہنسی مذاق۔ ہلکی بھلکی شاعری۔

وہ شن کو بھی خبردار کرنا چاہتی تھی مگر وہ تو شاید اپنے آپ میں ہی لگن تھی۔ اور خود پسندی میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ بھلا اس جیسی حسین پری کو چھوڑ کر تیمور کسی اور میں دلچسپی کیسے لے گا۔

وہ اکثر کہتی۔

”تمہارا بھائی بہت سزا ہے۔“

”بھی تم پوری جا دو گر نی جو ہو۔ ڈرتے ہیں نا۔ نگاہ ڈالی تم پر تو سحر زدہ ہو جائیں گے۔ پھر کس کام کاج کے نہیں رہیں گے۔ یہ جو اتنی لمبی زلفیں ہیں نا۔ یہ آنکھوں کی طرح انہیں جکڑ لیں گی۔ اور یہ جو تمہاری جمیل سی آنکھیں ہیں نا ان میں ڈوب گئے تو پھر سچ نہیں سکیں گے۔ تیرا جو نہیں آتا۔ اور یہ جو لب لعلیں ہیں نا تمہارے۔“

”اچھا۔ بس..... بس۔“ وہ اس سناٹوں کو قفاخر سے سمیٹے ہوئے بننے شرہ کو دو تین ہاتھ جڑ دیتی۔

”انہوں نے اپنی زبان تمہیں دے دی ہے کیا وہ آنکھیں پھیلا کر کہتی تو شرہ کندھے اچکا کاتی۔

”آف کورس۔ یہی سمجھ لو ڈیئر کزن۔ تمہیں پتا نہیں ہے یہ سڑے قسم کے اور نگاہوں کو بچا بچا کر چلنے والے ہوتے ہیں نا وہی ایک کے ہو کر رہتے ہیں اور ان کی محبت بھی گھر سے سمندر جیسی ہوتی ہے۔ ایک بار اپنے اندر ڈوبنے والے کو ابھرنے نہیں دیتے۔“

”اؤئے ہوئے۔ بڑی وکالت کر رہی ہو بھائی کی مگر شرہ ڈیئر

یہ تو فائنل ہے نا۔ تم تو میری راز داں۔ میری سہیلی ہو۔“

”بھی تم کو تو تمہارے دل کا حال بھی من و عن ان تک پہنچا دوں۔“ اور جواباً

شمن ایک گہری سانس بھر کر رہ جاتی۔

حال دل تو کھل چکا اس شہر میں ہر شخص پر
ہاں مگر اس شہر میں اک بے خبر بھی دیکھنا

اور اب شمرہ سوچ رہی تھی کہ وہ شمن کو کہہ دے گی کہ حال دل سننا بہت دیر نہ کرے۔ کہیں اس کا بھائی واقعی کسی اور کی زلفوں کا..... نہیں خدائے کرے۔
وہ تو تصور میں بھی شمن کے علاوہ کسی اور کو بھائی کے روپ میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس روز اس نے فون کر کے شمن کو صبح سے بلوایا تھا۔ چونکہ سڑے تھا۔ کالج بھی آف تھا اور گھر میں بھی فراغت تھی۔ سو وہ چلی آئی پھر اسے پکن میں مصروف دیکھ کر بولی۔
”یہ سب کس سلسلے کی تیاری ہے۔ کوئی آ رہا ہے کیا؟“ اس نے پیزا کے لئے شمرہ کو میدے سے اچھٹے پا کر پوچھا سلیپ پر بھی ارد گرد دیکھ بنانے کے لوازمات بکھرے پڑے تھے۔ ایک طرف پکن رول کے لئے پکن رکھی تھی۔ ٹوٹے ہوئے انڈے ایک پیالے میں پڑھے تھے وہ حیرت اور تجسس سے یہ سب دیکھ رہی تھیں۔

”اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ سب دیکھنے کی بجائے ہاتھ جیر چلاؤ۔ تم نے مونا کے یہاں ایک اس روز بڑا زبردست بنایا تھا۔ آج ذرا بناؤ تو۔“
”مگر یہ سب کس کیلئے کر رہی ہو؟ اٹھنا ٹھونسو گی خود کیا۔“ اس نے دو پٹا ایک طرف لٹکایا۔ آستین فولڈ کی اور انڈوں کو پھینٹتے ہوئے بولی۔

”ہاں اتنی ہی بیڑ ہو نا۔ کبھی ٹھونسا بے کیلا اتنا۔ وہ میدے میں حیر ملا کر اسے ایک ادنی کپڑے سے ڈھک کر بجھے اوون کے اندر رکھ کر ہاتھ بیسن میں دھونے لگی۔
”بھئی مجھے کیا پتا میں روز تمہاری جاسوسی تموز اسی کرتی ہوں۔“

”اچھا حکومت۔ اور سنو ایک مزے دار ہونا چاہیے اور آئنگنگ بھی کرنا اور اس پر لکھنا Happy Birthday شمرہ اس کا کندھا تھپک کر پکن کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے سر ہلادیا پھر یک دم چونکی اور میدہ چھاتے ہوئے چلائی۔
”اے اے“ کیا مطلب؟ برتھ ڈے۔ مگر ابھی دو ماہ پہلے ہی تو تمہاری برتھ ڈے آئی تھی۔ کیا پھر؟ شمرہ بے وقوف لڑکی لڑکیاں تو تین سالوں بعد اپنی ایک سالگرہ مناتی ہیں اور تم ہر دو مہینے کے بعد۔“

اف کس قدر احمق لڑکی ہو تم۔“ شمرہ پلٹ کر اسے گھورنے لگی۔ ”کیا اس پورے گھر میں بلکہ اس دنیا میں ایک واحد میری ہی سالگرہ ہو سکتی ہے۔ گدھی لڑکی، تیور بھائی بھی ہر سال بڑھتے ہیں۔“

”ایں۔ اس کا ہاتھ میدے کی کھیلی میں چھپ سے پڑا تو چونکی۔ پھر بیٹی کے انداز میں اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ایک خوب صورت رنگ اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گیا۔
”تو یہ کونسا۔ بے ہودہ لڑکی۔ اب دیکھنا کیسے کیسا بنا ہے بلکہ تم کہو تو بیڑ ابھی میں ہی بنا دوں۔“

شمرہ زور سے ہنسی۔
”اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ بعد شوق۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گذرتا ہے۔ تم معدے کا سب سے پہلے نشانہ لو۔ نشانہ ٹھیک لگا تو سمجھو دل بھی تمہارا۔“

”ارے جاؤ۔ تو وہ ہمارا ہی ہے۔ معدے کا راستہ وہ چنتی ہیں جن بے جا یوں کے پاس دل چننے کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہوتا۔ نہ شکل نہ عقل۔“ اور جابا شمرہ بقیہ مار کر نفس پر کیا۔ بات تو سو فیصد درست تھی۔

نازک سراپا۔

گوری جی رنکت۔

گھٹاؤں جیسے بال۔

وہ مکمل تھی اور اس پر ادائیں دل مولینے والیں۔

شام کے وقت دونوں نے نل کر لان کی کین کی ٹیبل لوازمات سے سجادی۔ اب تیور کے کمرے سے نکلنے کا انتظار ہونے لگا۔ وہ عموماً شام کی چائے اہل خانہ کے ساتھ لان میں ہی پیتا تھا۔ اسی لئے وہ حسب عادت لان میں آیا تھا مگر بیٹھے نہیں بلکہ اماں جان کو خدا حافظ کہنے۔

وہ پریس شدہ کپڑوں میں تازہ تازہ شیو کیے خوشبو میں بسا۔ ہاتھ میں گاڑی کی چابی لیے ادھر آیا اور ٹخن کو گویا اپنا دل پہلو سے ٹکاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ٹخن کو دیکھ کر اخلا قاس سے سلام دعا کرنے لگا۔

”کیسی ہو ٹخن؟“

”شکر ہے آپ کو نظر تو آئی میں۔“ وہ جواباً شرارت سے کہی۔ وہ نخل سا ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“

”کس بات کا؟“ اب بھی شرارت آمیز انداز تھا۔

”آپ بیٹھے تو سہی۔“ ٹمرہ اسے کھڑا دیکھ کر بولی۔

”نہیں بیٹھے ویسٹ ہسے کا تو تو نام نہیں ہے؟“ کہاں ہیں؟“ اس نے ریست

واج یہ نگاہ ڈالی۔ لوازمات سے جی میز پر اس کی نگاہیں نہ گئی تھیں۔

ٹمرہ اور ٹخن نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ٹمرہ بولی بلکہ چلائی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ جا رہے ہیں اور یہ جو بہت سامہم نے تیار کیا

ہے۔ کیوں؟ چتا ہے کچھ۔“

وہ اب کے چونکا۔ پہلے ٹیبل کو پھر ٹمرہ کو دیکھنے لگا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”آج آپ کی برتھ ڈے ہے۔ اور ہم نے بلکہ ٹخن نے آپ کو سر پرانز دیا ہے۔“

اسی نے ٹیک بیک کیا ہے اور پیزا بھی بنایا ہے۔

”اوہ۔“ اس نے ہونٹ بے ساختہ بھیج کر ٹخن پر نگاہ ڈالی۔ خاصی شرمندہ سی معذرت خواہانہ سی نگاہ تھی۔

”تم لوگوں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ اب تو میرا جانا بہت ضروری ہے۔ ایک دوست کو ٹائم دیا ہوا ہے۔“ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خاصا متاسف نظر آ رہا تھا۔

”کیا وہ دوست مجھ سے بھی اہم ہے؟“ ٹخن نے سر اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے اسے چنانا کر دے گی اس کے قدموں کو جکڑ لے گی۔ پھر کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔ خوب صورت لباس اور ٹیکے ٹیکے میک اپ میں وہ بھرپور اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر بلاشبہ حسین لگ رہی تھیں۔ بالوں کو اس نے پشت پر کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ جو کسی آبشار کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

تیوران کے انداز پر ذرا سا چونکا۔ پھر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے چابی پھیلی پراچھا لٹے ہوئے بولا۔

”بات اہم یا غیر اہم ہونے کی نہیں ہے بات زبان کی بنے کیے ہوئے وعدے کی ہے اور میں وعدہ خلاف بہر حال نہیں ہوں۔ آئی اہم سوری ٹخن۔ میں ٹمرہ نہیں سکتا میرا خیال ہے میری واپسی کا تم لوگ انتظار کرلو۔ رات تو ہماری ہی ہوگی نا۔ ہلہ گلہ کر لیں گے۔“ وہ آخر میں کچھ سوچ کر پچکارنے والے انداز میں بولا تھا پھر ان دونوں کے جواب کا انتظار

کے بغیر بولا۔

”اچھا اذکے۔ میں امی کو خدا حافظ کہہ آؤں۔ پلیز گرلز! مائنڈ مت کیجئے گا۔ آپ لوگوں کی محبت اور خلوص سر آنکھوں پر۔“ وہ ہنسا پھر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد بڑی تیزی سے باہر آیا اور روتی پر چلتا ہوا پوریکلو میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر یہ جاوہ جا۔
خمن اپنی جگہ ابھی تک پھر کے مجھے کی طرح کھڑی تھی۔ شرہ الگ شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی رہی۔ پھر سانس بھر کر بولی۔

”کیا خیال ہے انتظار نہ کر لیں ان کا؟“

خمن چپ چاپ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اسے بڑا دھچکا لگا تھا۔ تیور کے رویے سے۔ اسے ہیز اور ایک پر محنت کرنے کا دکھ نہیں تھا بلکہ اپنے اوپر کی گئی محنت کا دکھ تھا جو ضائع گئی تھی۔ اتنا حسین مرد پبلو میں دل رکھتے ہوئے بھی حسن کی پیش محسوس نہ کر سکتا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔

یا تو یہ شخص پاگل ہے یا پھر.....

یا پھر۔“ وہ آہنے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

یا پھر کیا ہو سکتا ہے؟“

”دراصل تیور بھائی۔ اپنے وعدے کے بہت کچے ہیں۔ اب کسی دوست کو نامم دے دیا ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے دوستوں نے ان کی تھوڑے کو سلیمہ یت کیا ہو۔“
”جو بھی ہو۔ لکھ لو کہ تمہارا بھائی انتہائی سڑو ہے۔“ وہ شرہ کا ہاتھ کندھے سے جھٹک کر بیڈ پر جا کر بیٹھی اور منہ بھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ شرہ بیٹنے لگی۔

”سارے بدلے گن گن کر لے لینا ایک بار سی۔ تم کہو تو امی کو بھیجوں اب۔“ وہ اس کی طرف جھکی تو وہ چہرہ موڑ کر اسے آنکھیں دکھانے لگی۔ تب شرہ مزید شرارت سے بیڈ

کے سائڈ بورڈ پر انگلیاں بجا کر گانے لگی۔

آئے گا کوئی آئے گا
دھڑکن دھڑکن پھول کھلیں گے
جھوم انھیں گے سارے نظارے
دلہن بن جائیں گی راہیں
دیکھ کے اسکو پھیلاؤں گی

”شرہ کی پچی۔“ اس نے نکلیہ اٹھا کر اسے دے مارا مگر شرہ خوشی اور شرارت سے ای ٹوئن میں گاتی رہیں۔

بھتا اس نے ترپا پا ہے
میں بھی اسے ترپاؤں گی
اک ادا سے ہاتھ چمڑا کر آج خفا ہو جاؤں گی
اپنی نظر میں پیار سجا کے
مجھ کو یار منائے گا
آئے گا کوئی آئے گا
دھڑکن دھڑکن پھول کھلیں گے

اس کی شرارتیں عروج پھیں۔ خمن اسے دوسرا تکیہ مار کر ہنستی ہوئی بیڈ سے اتر گئی۔ اور شرہ چیختی رہ گئی گروہ کر سے بھاگ نکلی۔



کئی دنوں سے دل کی دیواروں پر آہٹ دیتا حد شرہ کے دل کے دروازے پر آخرا کر دستک دینے چلا آیا۔ تیور میں ہونے والی تبدیلیوں کا محرک منظر عام پر آ گیا تھا۔ وہ

وہ جھٹ پٹ خوش خوشی اس کے ساتھ شہلا کے گھر دوڑ پڑتیں۔

”مگر اب شمن کا معاملہ تھا گو کہ انہوں نے کبھی بھائی بھادج سے اس خواہش کا اظہار تو نہ کیا تھا مگر دل ہی دل میں شمن کو بہو کا روپ دے بیٹھی تھیں۔

مگر اب تیور نے ان کا قصور نکمیر دیا تھا۔ وہ ایک خواب جو مسلسل دیکھتی آ رہی تھیں، ایک چھنا کے سے توڑا تھا۔ انہوں نے بڑی رغبت سے اسے دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”تم ایک بار پھر سوچ لو تیور! شمن بہت اچھی لڑکی ہے تمہیں خوش رکھے گی۔“

”یقیناً ای! شمن بہت بلکہ لاکھوں میں ایک ہوگی۔ مگر یقین کریں میں نے اسے کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں ہے اور اب جبکہ شہلا میرے دل میں ہے میں کیسے شمن کو دیکھ سکتا ہوں۔“ اس نے اپنی بات کے اختتام پر اماں کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر نرمی سے باتے ہوئے کہا۔

”میں گستاخ نہیں ہوں امی جان۔ آپ کا ہر فیصلہ سراسر آنکھوں پر۔ مگر میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں بٹ جاؤں گا دو خانوں میں، خود اپنی نظروں میں کر جاؤں گا، میرا وجود شمن کے پاس ہو گا مگر میرا دل، میری روح میرا ذہن شہلا کے پاس، میری نظریں شمن پر ہوں گی مگر میرے دھیان کے سب راستوں پر شہلا بیٹھی ہوگی۔ نہیں امی! اتنی مشکل، صبر آزما اذیت ناک زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ میں تنہا رہوں۔“ وہ اٹھنے لگا تھا کہ اماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے سوچنے دو تیور! تم نے برسوں میں کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں بھلا تمہیں کیسے مایوس کر سکتی ہوں۔ بس کچھ دن ٹھہر جاؤ۔“ انہوں نے یہ کہہ کر گہری سانس بھری پھر صوفے سے کھڑی ہو گئیں۔

اماں سے کسی شہلا نامی لڑکی کیلئے غائب کر رہا تھا۔

”اور شمن، شمن کا کیا ہو گا؟“ اماں کی آواز میں دل گرفتگی تھی۔ اور وہ تیور کے کمرے کے باہر دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی تھی۔

نہ وہاں سے ہٹنے کی سکت تھی نہ اندر جانے کا یارا۔

”شمن... کیا مطلب؟ شمن کون سی میرے نام پر بیٹھی ہے کہ اس کی فکر ہے آپ کو۔ یہ تو محض آپ کی خواہش تھی۔ صرف آپ کی۔ میں نے کبھی آپ سے شمن کا نام نہیں لیا۔ امی پلیز۔“

وہ اماں جان کے قریب فرش پر دوڑا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے لہجے میں ہی نہیں اس کی آنکھوں میں بھی منت سماجت اتر آئی۔

”آپ ایک بار شہلا سے مل تو لیں۔ وہ آپ کو بے حد پسند آئے گی امی! ہم دونوں کے درمیان بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ اور ذہنی ہم آہنگی تو رشتوں کو مضبوط کرتی ہے۔“

”مگر..... مگر شمن میں کیا خرابی ہے۔ گھر کی لڑکی ہے۔ میرے بھائی کی بیٹی۔ اچھی شکل، پڑھی لکھی۔ اچھے خاندان کی۔ اسے رد کر کے تم ایک غیر لڑکی کو لانا چاہتے ہو اس گھر میں۔“

اماں بڑی بے بسی سے اسے دیکھنے لگیں۔

تیور ان کا اکلوتا ڈالا بیٹا تھا۔ ان کا فرماں بردار ان کا چہیتا۔ آج سے پہلے کبھی ان کے کسی حکم کی سرطانی نہ کی تھی۔ ان کی باں کو ہاں اور ان کی ناں کو ناں تسلیم کیا تھا۔ اس کی فرماں برداری پر تو انہیں فخر تھا اور آج پہلی بار وہ اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔ ان سے بھیک مانگنے کی طرح اپنا جائز حق مانگ رہا تھا ان کا دل بیچ رہا تھا۔ اگر شمن کا معاملہ نہ ہوتا تو

سر بلا دیا۔

اس کا دل جا بادہ اماں کو پکڑ کر جھنجھوڑ دے اور کہے۔ ”خدا کے لئے امی! ثمن پر یہ ظلم مت کریں۔ شہلا بالکل بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ثمن پر فوقیت دی جائے۔ تیور بھائی کی تو آنکھوں پر پٹی چڑھ گئی ہے۔ جانے اس چڑیل نے کیا ستر پڑھ کر پھونکا ہے اس پر مگر وہ بے بسی سے خاموشی سے چائے گاگ بھر کر کچن سے باہر نکل آئی۔ اس اجنبی، ان دیکھی لڑکی سے اسے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

شام کو وہ ثمن کے کمرے میں اس کے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھی تھی اور ثمن کیسٹ پلیئر میں اپنی پسند کی کیسٹ رپوائنڈ کر رہی تھی جب اس نے اپنے بیگ سے وہ تصویر نکالی اور اس کے آگے ڈال دی۔

”تم اور میں۔ یہی سمجھتے رہے آج تک کہ تیور بھائی بالکل بے حس ہیں ان کے اندر محبت کرنے اور محبت محسوس کرنے کی حس ہی نہیں ہے۔ مگر آج ان کی بے حس طبیعت سے لافانی اور بے گانگی کا سبب بھی مل گیا ہے۔ یہ ہے وہ سبب“ وہ بے حس نہیں ہیں۔“
ثمن اچھل کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ ریشمی زلفیں ادھر ادھر کھٹکھٹیں اور سیاہ زلفوں کے ہالے میں اس کا چہرہ بالکل سادہ کسی مجسمے کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ بس وہ آنکھیں اٹھا کر شمرہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”یہ ہے وہ لڑکی جس سے وہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر شمرہ نے نگاہیں جھکا لیں اور ہونٹ کاٹنے لگی۔

ثمن نے لرزتی انگلیوں سے اپنے سامنے پڑی تصویر اٹھائی مگر جوں ہی تصویر پر نگاہ پڑی ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھڑ گئی۔ اس نے ثمن کو ابرو اچکا کر دیکھا پھر دوبارہ اس تصویر کو دیکھنے ہوئے استہرا سہی۔

تیور کا چہرہ یوں دمک اٹھا جیسے کسی نے نیچے ہوئے دیئے میں ایک دم دھیر سا راتیل اٹیل دیا ہو جب کہ وہ رات شمرہ کے لئے بے حد بھاری تھی۔ اسے شدید قسم کا ذہنی دھچکا لگا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ثمن کے علاوہ اس کی بھابی بن کر کوئی اور لڑکی بھی آ سکتی ہے۔

”بھلا ایسا کیا ہے اس لڑکی میں جس کے لئے تیور نے ثمن جیسی حسین لڑکی کو رو کیا ہے۔“

ایک دم تجسس کی ایک لہر اندر سے اٹھی۔ اسے اس اجنبی لڑکی کو دیکھنے کی تمنا ہوئی۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ وہ ثمن کے مقابلے میں کم ہوگی۔ اور اسکا یہ یقین سو فیصد درست نکلا۔

تیور کے آفس جاتے ہی اس نے اس کے کمرے میں چھان پھنک کی تو اسے بریف کیس سے تصویر مل گئی۔ وہ تصویر دیکھ کر حیرت سے لنگ رہ گئی۔ اسے یقین تو تھا ہی کہ وہ ثمن سے کم شکل کی ہوگی مگر اس قدر عامی صورت ہونے کا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اماں کی آواز پر اس نے جلدی سے بریف کیس بند کیا اور تصویر لئے کمرے سے باہر نکل آئی اور تصویر اپنے کالج بیگ میں رکھ دی۔

”آج تم کا نہیں گئیں۔“ وہ کچن میں آئی تو اماں بولیں۔

”نہیں! کچھ بھاری بھاری ساہو باہے۔“

اس نے یہ کہہ کر جانے کی کشتی اٹھا کر چولہے پر رکھی۔ ”امی میں ماموں کی طرف جاؤں گی۔ ثمن نے بھی جھپٹی کی ہے۔ ہم دونوں مل کر اپنا جوتل پورا کر لیں گے۔“ وہ ان سے نظریں چرا کر کینٹ سے گٹ نکالتے ہوئے بولی، اور ردیدہ نگاہوں سے اماں کو دیکھا جن کا تیزی سے حرکت کرتا ہاتھ ذرا دیر کو رکھا تھا۔ پھر انہوں نے دوبارہ پیاز کاٹنے ہوئے

”مجھے بے وقوف بنانے کیلئے کم از کم حسین نہ سہی کم حسین لڑکی کی ہی تصویر ڈھونڈ ڈھاؤں کر لے آئیں۔ کیا اس سے میں ڈر جاؤں گی۔ اونہہ شادی کر رہا ہے تیمور اس سے۔“ اس نے تصویر سے پرائگلیاں ماریں شرہ نے دل گرگئی سے اسے دیکھا۔

”یہ مذاق نہیں ہے شن۔“ اس نے کرب کی اٹھامیں ڈوب کر پلکے سے چیخ کر کہا تھا۔ ”یہ حقیقت ہے میں نے یہ تصویر ان کے بریف کیس سے نکالی ہے۔ شہلا نام ہے اور.....“

”کم آن شرہ۔ اس..... اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تیمور۔ کیا پاگل ہوا ہے وہ۔“

”پاگل ہی تو ہو رہے ہیں۔“ شرہ کی سانس دھیرے سے خارج ہو گئی۔

شن کے چہرے پر لمحہ بھر کو تاریک سایا سا گزر گیا۔ شرہ کا لہجہ اس کے اعصاب کو مضطرب کرنے لگا۔

اس کی نظریں تصویر پر جم گئیں۔ پھر وہ یکا یک بے اختیار ہنس پڑی۔

”میں ہرگز یقین نہیں کر سکتی کہ تمہارے بھائی کا ٹیسٹ اس قدر بوگس ہو سکتا ہے۔ نہیں میں نہیں مان سکتی اور اس..... اس شکل کو مجھ پر فوقیت دے گا کیا ہے اس میں؟ دیکھو..... دیکھو ذرا۔ ایسے ایسے چہرے بھی بھلا دلوں کو تغیر کر سکتے ہیں۔ کسی کو اپنا دیوانہ بنا سکتے ہیں۔ اوہ نو۔ ہاؤ فن۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسنے پھٹنے کا ایک اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ شرہ رنگ سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے دیکھا شن نے دراز کھولی اور سیاہ رنگ کا مارکر نکالا اور تصویر پر پھیرنے لگی۔

”کک..... کیا کر رہی ہو شن؟ یہ تصویر تو۔“

”کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ پہلے بھی ایسی ہی نظر آتی تھی اب بھی وہی رہے گی“

دیکھو۔“ اس نے تصویر اٹھا کر شرہ کے سامنے کر دی مونسے سیاہ اسپرٹ مارکر سے لکیریں تصویر کے چہرے پر ادھر ادھر کھینچی ہوئی تھیں۔

”بھلا یہ مارکر اس کا کیا لگاؤ سکتا ہے جب تقدیر اسے سنوار رہی ہے۔ ہاں تقدیر۔“ اس نے تصویر پھینکی اور پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

”شن۔“ شرہ اس سے لپٹ گئی۔ ”یوں مت رو شن۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں اور امی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔“

شرہ کا لہجہ بڑا کمزور سا تھا تو جیسے سایا روشنی سے لرزتا ہوا محسوس ہو۔ چونکہ اسے اپنے الفاظ کی کم مانگی کا احساس تھا۔ اپنے کمزور ہونے کا احساس تھا۔ پھر وہ خود بھی رو پڑی۔



شن کی حالت اب شرہ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس نے کالج جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ممائی الگ پریشان تھیں۔ وہ شرہ سے پوچھتیں کہ یکا یک شن کو کیا ہو گیا ہے۔ اور شرہ انہیں بہانے سے ٹال دیتی۔

ادھر تیمور کے علم میں شن کی یہ شدتیں آئیں تو اسے اچھا خاصا غصہ آ گیا۔

”میں نے اس سے کسی قسم کے وعدے و وعید نہیں کیے ہیں نہ اس کی کبھی پذیرائی کی ہے۔ بلکہ میں تو اس سے باتیں بھی ایک فاصلے سے کرتا رہا ہوں۔ اب یہ اس کی خود ساختہ پریشانیاں ہیں۔ آپ ممائی جان سے کہئے کہ اس کی کسی اچھی جگہ شادی کر دیں۔ وہ رفتہ رفتہ معمول پر آ جائے گی۔“

اس نے اماں جان کو مزید اس کی حمایت سے روکنے ہوئے ساتھ مشورے سے بھی نوازا دیا۔

اماں جان چسپ ہی ہو کر رہ گئیں مگر شمرہ نے ہمت نہ ہاری اور ایک کوشش خود کرتے ہوئے رات اس کے پاس آئی اور اسے الجھے گئی تو وہ غصے سے باہری ہو گیا۔

”تم لوگ سمجھتے کیا ہو آخر۔ کیوں مجھے الزام دے رہے ہو۔ کب میں نے اسے آس دلائی تھی۔ اس سے عہد و پیمان باندھے تھے کب اسے کوئی اشارہ دیا تھا۔“ اس نے بری طرح غصے سے شرہ لکھوڑا۔ وہ ہونٹ کانٹے ہوئے دل گرفتگی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ تیور نے خود کو کرسی پر گرالیا اور جیسے لمبے میں بولا۔

”دیکھو شرہ! شادی بیاہ کوئی جبر کا سودا نہیں ہے۔ میرے پاس اس کو دینے کو کچھ نہیں ہے۔ اول تو میں قربانی دینے کا قائل نہیں ہوں بالضرر حال کر بھی لیا تو اسے کوئی خوش نہیں دے سکوں گا۔ بلکہ خود بھی بے سکون رہوں گا۔“

”مگر..... مگر وہ تو اتنی عامی لڑکی ہے آپ کو کیا نظر آیا ہے اس میں۔ شمن کے مقابلے میں تو وہ۔“ وہ دوسرا حربہ آزمائے لگی۔ وہ اس وقت شمن کی زبردست حمایتی دکھائی دے رہی تھی۔ تیور نے ابرو چکا کر اسے دیکھا پھر دھیرے سے مسکرانے لگا۔

”جانتا ہوں یہ تمہاری نہیں شمن کی زبان بول رہی ہے تمہارے منہ میں۔“ اس کے لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی۔ ”اے اپنے حسن اور ناز و ادا پر بڑا زعم رہا ہے۔ میں نادان یا کم سن نہیں ہوں۔ مرد ہوں شمرہ۔ عورت کی ہر نظر سمجھتا ہوں۔ اس کی وارفتگیوں“ اس کی نظر واداکے تیر۔“

وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ شمرہ نے چہرہ جھکا لیا۔

”بہت سطحی لڑکی ہے شمن! اس میں اور شہلا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے گردن اٹھا کر شرہ کو دیکھا۔

”حسن کیا ہر مرد کی کمزوری ہوتا ہے۔ حسن وہی نہیں جو دکھائی دے۔ حسن وہ بھی

ہے جو محسوس ہو۔ اور میرے نزدیک محسوس کیا جانے والا حسن ہی پائیدار ہوتا ہے۔ اگر شکلوں، صورتوں سے تمجیسی کی جائیں تو دنیا کا ہر مرد مغرب کی طرف ہی دوڑتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ محبت تو جنت سے اترا ہوا جذبہ ہے۔ بہت اعلیٰ اور ارفع۔ یہ شکل، صورت، دولت، امارت بے بے نیاز ہے۔ جاؤ اور اسے سمجھاؤ کہ وہ یہ بچکانہ حرکتیں بند کر دے اور اپنی پڑھائی پر توجہ دے اور جہاں ممانی جان اس کا رشتہ کر دیں وہاں سر جھکا دے۔ عورت کا وقار فرماں برداری میں ہے نہ کہ باغیانہ پن میں۔“ اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ اور کرسی سے اٹھ کر دروازے سے فائلیں نکال کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ شرہ کو ہنوز اپنی جگہ کھڑے دیکھا تو بولا۔

”جاتے جاتے دروازہ اچھی طرح بند کر کے جانا۔“

شرہ نے بے چارگی سے بھائی کا چہرہ دیکھا اور ناچار پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ جاتے جاتے اس کی تاکید پر عمل کرتے ہوئے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا پھر بند دروازے پر ایک پر لال نگاہ ڈال کر وہاں سے ہٹ آئی۔



”شمن! تیور بھائی اپنے دل کا دروازہ بہت سختی سے بند کر چکے ہیں تمہارے لئے اس میں خفیف سی دراڑ بھی نہیں ہے۔“ وہ شمن سے کہہ رہی تھی۔ کہ اب اسے ہر طرح سے سمجھانا بھجنا ہی تھا۔ ”خود کو ہلکان مت کرو۔ بھول جاؤ انہیں۔ نکال دو انہیں دل سے کہ کبھی جیسے وہ تمہارے دل میں اتارے ہی نہ تھے۔“

”شرہ! اگر شہلا تیور کی زندگی میں نہ آتی تو میری ہی جگہ تھی نا۔“ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سگے سگے لمبے میں بولی۔ شرہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے اندر دو دھارے چلنے لگے تھے ایک دھارا اس نفرت کا تھا جو شہلا ناکی لڑکی کے خلاف پیدا ہو چکا تھا اور دوسرا دھارا شمن سے محبت، دوستی کا تھا۔ اس کی تڑپ اسے تڑپا رہی تھی۔ اس کی نا

آسودگی لا حاصلی اسے رلارہی تھی۔

نفرت بہت تیزی سے غیر محسوس طریقے سے ہمارے اندر جڑ پکڑنے لگتی ہے اور یہ تو ایسی شے ہے جس کا رخ ہمیں کہیں بھی گرا سکتا ہے اس لیے ان دونوں کے دل میں اس اجنبی لڑکی کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی تھی اور بہت تیزی سے جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ اور جب وہ اجنبی لڑکی ایک خوب صورت رشتے میں بندھ کر ”تیورولا“ میں اتری تو شمرہ کے اندر اس کے خلاف نفرت کا ایک تاور درخت اگ آیا تھا۔

اس نے بڑے رسمی انداز میں ساری رسموں میں شرکت کی۔ شمن بھی بحالت مجبوری شریک رہی۔ اس کا چہرہ قدم قدم پر تاریک پڑتا رہا۔ قدم قدم پر بے چارگی آ میر کر ب نفرت بن کر رگوں میں دوڑتا رہا۔ وہ خاندان کی دوسری لڑکیوں سے ہٹ کر بس شمرہ کے ساتھ ساتھ رہی۔

مبارک دینے بھی وہ اسٹیج پر مجبور آئی تھی۔ فان کلر کے راجہ سہستانی سوٹ میں دلہن سووی اور کیمرہ اور ساتھ لڑکیوں کی ہنسی مذاق کی زد میں بیٹھی پر اعتماد مطمئن اور شاد نظر آ رہی تھی۔

یقیناً یہ اعتماد یہ طمانیت قریب بیٹھے تیور کا دیا ہوا تھا جو اس کا مکمل نمکھان اور حامی نظر آ رہا تھا۔

”آپ کی دلہن تو آج واقعی لا جواب نظر آ رہی ہے تیور بھائی“ وہ اپنا کامدانی دوپٹا شانے پر ڈال کر اس کی طرف چلی آئی۔

تیور نے اسے ایک نظر دیکھا اور مسکرا دیا۔ ”گلتا ہے کسی مہنگے بیوٹی پارلر سے تیار ہوئی ہیں۔ ہاں ظاہر ہے عامی صورت سے تو یہی پارلر چلتے ہیں۔ یہ دن تو یوں بھی اہم ہوتا ہے اب اس میں بھی بندہ بد صورت لگے تو۔“

تیور سووی والے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دانستہ اس نے اس کے جملے کو نظر انداز کر دیا تھا مگر دلہن بنی شہلا کے دل پر تیر چل گیا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اس تیر چلانے والی کی طرف دیکھا اور جیسے لحظہ بھر دیکھتی رہی۔ گولڈن اور سیاہ استراچ کے پاجامہ سوٹ اور بڑے سے کامدانی ٹشو کے دوپٹا میں وہ بلاشبہ ایک دل آویز اور حسین لڑکی تھی۔ گوری رنگت پر ہلکا ہلکا گولڈن براؤن میک اپ اور کھلے بالوں کے ہمراہ۔ وہ لڑکی اپنی گلیلی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شمرہ کھڑی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اور دبی دبی ہنسی ہنستے ہوئے۔

”شمرہ! امی کو بلاؤ۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔ تم لوگوں کی تو ریسیں ہی ختم نہیں ہو رہی ہیں۔“

تیور یک دم شمرہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا تو اسٹیج پر موجود شریک لڑکیاں ”اوئے ہوئے“ کر کے ہنسنے لگیں اور جملے کسے لگیں۔

”دوہا بھائی! اتنی جلدی بھی کیا بنے۔ دلہن آپ ہی کی ہے بے فکر رہنے۔“

”ابھی تو تین چار گھنٹے اور لگ جائیں گے۔“

”نہ..... نہ..... نہ.....“ ابھی اتنا ظلم مت کرنا بے چاری دلہن کا میک اپ تو سارا بہہ جائے گا۔ اب اصلی صورت نکلتے سے پہلے رخصتی ہو جائے تو اچھا ہے۔“

شمن کسی کے جملے کے جواب میں بولی تھی۔

”شمرہ! میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔“ تیور بیچھے ہوئے لب کھول کر ہلکی آواز میں ڈپٹ کر بولا تو شمرہ جلدی سے اسٹیج سے نیچے اتر گئی۔

شمن کے لبوں پر مسکراہٹ نکھر آئی۔ اس نے ابرو چڑھا کر تیور کے چہرے کا جائزہ لیا جو اس کے جملے پر انتہائی برا فروخت ہو گیا تھا۔ جیسے بحالت مجبوری برداشت کر گیا ہو۔ جب

کہ وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ دلہن کی طرف جھکتے ہوئے اپنا گداز خوب صورت ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔ اب انشاء اللہ دو دن بعد ملاقات ہوگی۔“ اس نے اپنا سجا سورا ہاتھ یوں پیش کیا جیسے کوئی خوب صورت چیز سراہنے کے لئے پیش کی جائے۔ بلاشبہ وہ ہاتھ نظر بھر کر دیکھنے کے قابل تھا مگر شہلا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ تمام کر چلکے سے چھو کر چھوڑ دیا۔

شادی ویسے کے بعد کچھ دن تو تیمور اور شہلا دعوتیں امینڈ کرتے رہے۔ پھر کہیں جا کر فراغت کے لئے میسر آئے تو مہمانی جانِ دعوت دینے چلی آئیں مگر تیمور نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ابھی تو فراغت ملی ہے۔ اب کاروبار بھی توجہ مانگتا ہے۔ کچھ مہفتوں کے بعد ہم دونوں خود آجائیں گے۔“

تیمور کے اس انکار پر اماں جان ذرا ساجیران ہوئیں تاہم بولیں کچھ نہیں۔ شمرہ کو بھی بڑا برا لگا تھا۔ خاندان بھر کی دعوتیں کھالیں۔ شمن کے گھر ہی کیوں انکار کر دیا۔ یقیناً بھابی ”شہلا“ نے بھی روکا ہوگا۔ رات شمن خود چلی آئی۔

”ہمارے گھر کا کھانا اتنا برا نہیں پکتا تیمور صاحب کہ آپ یوں دامن بچا گئے۔ زہر تو نہیں کھلا دیتی میں۔“ وہ بظاہر ہنستے ہوئے بولی مگر اس کے لہجے میں آئی آج تیمور کے ساتھ شہلا بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکی۔ مگر سر اٹھانے کی بجائے اماں کے تخت پر چڑھی اماں کے ساتھ کر دیشا کا دھاگہ سلجھاتی رہی۔

تیمور ریوٹ سے ٹی وی بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”کیا بھروسہ نہ تمہارا۔ زہر کھلا بھی دیتی۔“ بظاہر اس نے بھی خوش دلی کے تاثر کے ساتھ ہی کہا تھا مگر جملہ اس کے دل پر لگا۔ وہ اٹھ گئی اور کچن کی طرف بڑھنے سے پہلے ذرا سہاراک کر بولی۔

”آج سے پہلے کبھی کھلایا ہے۔“

”آج سے پہلے کبھی یوں دعوت ہی نہیں دی بھدا اصرار۔“ وہ بھی اسے چھیڑنے

کی غرض سے بولا تھا۔ وہ کچھ برا ماننے ہوئے بولی۔

”یہ تو آپ کا خیال ہے وگرنہ ہمارے گھر کے دروازے تو بلکہ ہر طرح کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہی ہیں ہمیشہ سے۔ اب آپ ہی قدم نہ گھس یہ آپ کی مرضی۔“

تیمور بری طرح شٹاپ گیا تھا اور یونہی بے اختیار شہلا کی طرف دیکھا مگر وہ بے حد پرسکون اور اپنے اسی اعتماد کے ساتھ بیٹھی مصروف رہی۔ جب کہ اماں جان اس کے جملے کے مفہوم اور لہجے کی آنچ سے بے نیاز بولیں۔

”نہ شمن، تم دل پر نہ لینا۔ میں نے شہلا کو بھی کہا ہے جوں ہی وہ ذرا فارغ ہوں گے تمہارے گھر آئیں گے۔ بس کئی دنوں سے لگا تار کاروبار کی طرف توجہ بھی نہیں دے سکا ہے نا۔ اسی وجہ سے انکار کر رہا ہے۔“ انہوں نے جیسے تیمور کی طرف سے اس کا دل صاف کرنا چاہا مگر جیو تھور کی طرف سے گدلا ہوا تھا وہ بھلا اماں جان کی کوششوں سے کیسے صاف ہو سکتا تھا۔ وہ بس ایک استہزا آمیز مسکراہٹ اچھال کر شمرہ کے پاس کچن میں چلی آئی۔

شمرہ سلاہ بنا رہی تھی رات کے کھانے کے لئے وہ کھیرے کا ایک کلو اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے ناگوار رہی بولی۔

”یہ سارا سارا دن تم کام میں مصروف رہتی ہو۔ وہ مہارانی کس مرض کی

دوا ہے؟“

”وہ مہارانی جانی کی ہی نہیں امی کی بھی منظور نظر بن کر رہ گئی ہے۔ سو ابھی اس کا دلہنا یا ختم نہیں ہوا ہے بقول اماں جان کے۔“ وہ اس سے بھی زہر بھرے لہجے میں بولی۔ اور

صاف جھوٹ بول گئی۔

حالا کہ شہلا نے نہایت خوش اسلوبی سے باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ اماں لاکھ منع کرتی رہ جاتیں کہ ابھی تمہارے کام کاج کے دن نہیں ہیں۔ مگر وہ کب مانع تھی۔

”عورت بنا کام کاج کے بیٹھی ہوئی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی اماں جان! اور مجھے کون سا پہاڑ توڑے ہیں۔ بس یہ چھوٹے موٹے کام ہی تو ہیں۔“

اماں جان تو اس کی ہر ہر ادھر پر غار جاتیں۔ وہ اماں کے پاس فارغ وقت میں بیٹھی ان سے ان کی باتیں سنتی۔ ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔ گھر کی ملازمہ جنت بی بی اس کے گن گاتے نہ تھکتیں وہ عام سے چہرے والی اپنے اندر ایک سحر کھتی تھی یہ سحر اس کا ہمدرد دل، مخلصانہ اور محبت آمیز رویہ تھا۔ جیسی پرسکون پر اعتماد مسکرائیں، نظر انداز کرنے کی عادتیں تھیں۔

شمن ڈھونڈتی رہ جاتی کہ وہ کون سا سحر ہے جس نے پورے گھر بھر اور خاندان کی عورتوں کو بھی اس کا سیر کر ڈالا ہے۔ جسے دیکھو تیور کی بیوی کے گن گائے جا رہا ہے۔ بس شمرہ ہی تھی جو اس سے کھینچ کھینچ رہتی۔ بلکہ کبھی کبھی تو نفرت کا کھلا اظہار کر ڈالتی۔ شمن جیلے بازی کرتی تو اس کا ساتھ دے کر خوب ہنستی۔

اس کا طرز عمل اماں جان کو بہت کھٹکتا۔ ایک روز انہوں نے اس کی خوب خبر لے ڈالی۔

”شرم کر دشرہ! کس بات کا انتقام لیتی رہتی ہو تم اس بچی سے۔ شمن تو پرانی لڑکی ہے میں اسے کچھ کہہ کر اس کا دل خراب نہیں کرنا چاہتی مگر تم تو اس گھر کی ہو۔ بھائی ہے وہ تمہاری، تمہارے چہیتے بھائی کی بیوی۔ کچھ تو لحاظ کرو۔ وہ اگر تمہیں جواباً کچھ نہیں کہتی تو یہ اس کی بڑائی ہے دگر نہ وہ پورا حق رکھتی ہے تمہیں اس لب و لہجے میں جواب دینے کا۔ اور

تیور بھی چھوٹی بہن سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔“

”آپ ہی پوچھا کیجئے اس ڈاڑھی کی۔ میں تو اپنا مزاج اس کے لئے نہیں بدل سکتی۔“ وہ پیر پٹخ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اماں تاسف سے گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

رشتے تو آسان پر طے ہوئے ہیں شمرہ! اس میں کسی کا کیا دوش۔ تیور اور شہلا کا جوڑ بھی اللہ نے بنایا ہے۔ اور اب اس پر مسلسل ناخوشی کا اظہار کرتے رہنا اللہ کے فیصلے سے سرکشی اس کی نافرمانی اور اس پر تنقید کرنا ہوا۔ اللہ تمہیں سمجھ عطا کرے۔

انہوں نے صدق دل سے بیٹی کے لئے ہدایت مانگی مگر جو خود ہدایت نہ پانا چاہے اسے کیوں کر ہدایت مل سکتی ہے۔ اس کے اندر تو نفرت کی خورد و جھاڑیوں کا جنگل اگتا جا رہا تھا جو روز بروز گھٹنا جنگل ہوتا جا رہا تھا۔

شہلا کبھی کبھی حیران ہو جاتی کہ آخر اس نے شمرہ کا ایسا کون سا نقصان کر ڈالا ہے۔ جو وہ اس سے اتنی متحضر ہے۔ اس سے کھینچ کھینچ رہتی ہے۔

اس روز وہ بدحد دھکی ہوئی جب ایک بیٹے کو نم دینے کے باوجود اس کی خوشی کو شمرہ نے ملایا میٹ کر دیا۔

”اوف.... اس قدر بد صورت بچہ۔ ہمارے خاندان کی سات پشتوں میں پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ ہے نا می!“

وہ کارت میں سوئے بچے کو دیکھ کر حقارت سے بولی تھی تیور تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر اماں نے اسے خوب سنا دیں۔

”انیسے کون سے حسین بیٹے ہیں تمہارے خاندان میں کہ یہ اتنا اچھا بھلا تمہیں بد صورت نظر آنے لگا ہے۔ خدا کا خوف کرو شمرہ۔ اللہ کی بنائی ہوئی صورت پر ہم بھلا کیا حق رکھتے ہیں۔ تنقید کا تمہارے چہرے پر نگلی ایک پھنسی تک تو ٹھیک کر لو۔ سستیں۔ دانت تک بنائیں

سکتیں۔ اور چلی ہو اس کی بے عیب ذات پر تنقید کرنے۔“

”چھوڑیں اماں! شمرہ تو یوں ہی مذاق کر رہی ہے۔“ شہلا فوراً درمیان میں بول پڑی۔ وہ ماحول میں پھیلی خوش اور خوش گواری کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔

پہلے پہلے بچے اور وہ بیٹے کی سرست تیمور اور اماں کے رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔ وہ بھی خود کو ہلکا اور پرست محسوس کر رہی تھی۔

اسپتال سے گھر آئی تو تیمور نے اسے ڈائننگ کے نوپس دیے۔

”میں تو آپ کو ہیرے جیسا بیٹا نہ دے سکی تیمور۔“ وہ کانوں میں پڑیں بالیاں اتار کر نوپس پہنتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں گرتگی سی سے در آئی۔

تیمور نے بیڈ پر سوئے بچے کو گود میں اٹھا کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کی گود میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”تم نے شمرہ کی بات دل پر لے لی ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا اس کے منہ میں شرن

کی زبان ہے۔ اس کی اپنی نہیں۔ دیکھو اسے غور سے۔ کیا یہ ہیروں موتیوں سے کم ہے۔“

اس نے آنکھیں موندے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ تو شہلا کی نگاہیں بھی اپنے بیٹے پر جم گئیں رگ رگ سے محبت کی لہریں بہنے لگیں۔ اس نے بے اختیار اس کے رخسار چوم لیے۔

”یاد ہے شہلا! جب میں تمہارے پیچھے بھاڑتا تھا اور تم مجھے ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ میں اپنے آفس میں جانے سے پہلے تمہارے جیبیر میں آ کر جھانکتا تھا اور تم چڑچڑاتی تھیں۔ پھر ایک بار رنج ہو کر پوچھا تھا مجھ سے کہ ایسا کیا نظر آ گیا ہے مجھ میں تیمور صاحب

آپ کو؟“

تیمور بیڈ کی پشت سے لگ کر اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا تو شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ہاں یاد ہے۔ مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس وقت۔“

”ہاں اس لئے کہ اس وقت جواب جو میرے پاس تھا وہ اگر دے دیتا تو تم خفا ہو

جاتیں! کچھ بعید نہ تھا کہ اپنا سینڈل اتار کر میرے سر پر بجا دیتیں۔“

”ایسے ہی۔“ وہ آنکھیں پھیلا کر اسے گھورنے لگی۔ پھر بچے کو کارٹ میں ڈال کر ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا جواب تھا اس وقت آپ کے پاس؟“

اور جواباً تیمور اسے دل آویز نگاہوں سے دیکھنے لگا کہ اس کی پلٹیں خساروں پر جھک گئیں۔

”تمہارے اندر ایک سحر ہے شہلا۔ ایک طلسم ہے جو میرے دل کو جکڑے ہوئے ہے۔ مجھے لگتا ہے تم مقناطیس ہو اور میں لوہے کا گولڑا۔“

”یہی تو پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایسا کیا طلسم ہے مجھ میں؟ میں تو بہت عام سی ہوں۔“ وہ سلجھے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر چہرے کے ایک طرف ڈال کر دھیرے دھیرے برش پھیرنے لگی۔

”ایک بات پوچھوں تیمور؟“ اس نے تیمور کی طرف دیکھا جو اس کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ دھیرے سے مسکرا دیا اور اس کے ہاتھ سے برش لے کر اس کے بالوں کو نکھیرتے ہوئے بولا۔

”یہی تو پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ میں نے اتنی حسین جمیل شمن سے شادی کیوں نہیں کی جبکہ وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔“ تو بات یہ ہے ڈیکرہ شخص کا معیار حسن مختلف ہوتا ہے۔ ضروری

نہیں ہر شخص چاند کا عاشق ہو۔ رات بھر چاندنی میں بیٹھ کر چاند کا نظارہ کرنا چھاندا لگتا ہو۔“ اس کا لہجہ یک یک تنجیدگی میں سے ڈھل گیا۔ ”میں بڑا پریکٹیکل آدمی ہوں۔ ظاہری حسن

ظاہری حسن نہ میری کمزوری ہے نہ میرا تقاضا۔ میں اپنی شریک حیات میں خوبیاں دیکھنا چاہتا تھا باطنی خوبیاں۔ جو دیکھ رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شہلا کو بڑی نرم نظروں سے دیکھا پھر اسی سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے ہیوی چاہئے تھی۔ شوکیں میں سجانے کے لئے شوپیں نہیں۔ اور بات یہ ہے شہلا کہ میں نے اپنے ہم سفر کیلئے جو آئیڈیل بنا کر رکھا تھا یا یہ سمجھو کہ میرے ذہن میں جو آئیڈیل تھا اس پر تم پوری اتریں۔ اسے تم تو ہی ہم آہنگی سمجھ لو دل کا تمہاری طرف کھنچاؤ سمجھ لو یا کچھ بھی۔ یوں بھی دنیا میں حسین چروں کی کمی نہیں ہے ہاں باطنی خوب صورتیاں عورت کے اندر سے بہت تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ ظاہری حسن آنکھ کو وقتی طور پر متاثر کرتا ہے مگر باطنی حسن دل کو اپنا سیر کر ڈالتا ہے۔“

شہلا کو اپنے اندر بہت سبک سویرے اترتے محسوس ہونے لگے۔ وہ اپنے رب کے حضور جتنی بار بھی سجدہ ریز ہوتی کم تھا۔ اس نے سوچا کہ ”پتا نہیں مجھ میں کیا خوبیاں ہیں بس اس کے شریک حیات کی نگاہوں اور دل میں اس کے لئے محبت کی جو جوت مل رہی تھی وہ اس رب کریم کی عنایت ہی تھی۔ میں تو فانی۔ عیبوں سے بھری۔ میری بساط ہی کیا تھی کسی انسان کے دل میں گھر کرنے کی۔

ہاں محبت تو جنت سے اتر ا ہوا تختہ ہے جسے چاہے رب کریم بخش دے۔



زندگی بڑی خوب صورت ہو گئی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس میں شرہ یا شمن کی نفرتوں کے آتش جیسے پڑتے تو وقتی طور پر ایک ملول سی چادر تن جاتی دل کی فضا پر مگر اسے تیمور اور اماں جان کی محبت، حمایت حاصل تھی۔ ان کی محبتوں سے دامن اتتا بھرا ہوا تھا کہ وہ شرہ کو ہمیشہ چھوٹی بہن سمجھ کر معاف کرتی رہی۔ اور شمن کے تعذیب آمیز جملوں کو خاموشی سے

برداشت کر جاتی کہ بدلے میں اسے اتنی نعمتیں جوت مل جاتی تھیں۔

”شرہ“ عمر سے یوں دور بھاگتی جیسے وہ جھوٹ ہو کوئی بلا ہو اس سے چمٹ جائے گا۔ چلتے پھرتے اس کی سانولی رنگت پر چوٹ کرتی۔ اگلے سیدھے نام رکھتی اماں کی ڈانٹ ڈپٹ کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

انہی دنوں جب زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔ شہلا پھر ”امید“ سے تھی۔ کہ ایک دن اچانک تیمور کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی۔ اس کے دوست نے، بی فون کر کے اطلاع دی تھی وہ میڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس خبر پر بدحواسی میں اس کا پاؤں رپٹ گیا وہ تیمور کا میڑھیوں سے پھسلتی چلی گئی۔

اماں اور شرہ بھاگ کر آئیں مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ادھر تیمور کے ایکسیڈنٹ کی خبر اور دوسری اس کی یہ حالت دیکھ کر اماں تو ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھیں۔ شرہ نے جلدی سے ڈرائیور کو آواز دی اور ملازمہ کے ساتھ شہلا کو گاڑی میں ڈالا۔

تیمور کا ایکسیڈنٹ اتنا شدید نہیں تھا بلکہ زخم آئے تھے اسے فرسٹ ایڈ دے کر اس کا دوست گھر چھوڑنے آ رہا تھا تو ملازمہ سے شہلا کے میڑھیوں سے پھسلنے کی اطلاع پا کر وہ پریشان ہو کر وہیں اسپتال دوڑ گیا۔

اماں تو اسے خیر و عافیت میں دیکھ کر پہلے خوش ہوئیں پھر دھازیں مار مار کر رونے لگیں۔

”تیمور! ڈاکٹر کہہ رہے ہیں شہلا کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔ اندرونی چوٹ لگی ہے اور..... اور بچہ بھی ضائع ہو گیا ہے۔“

انہوں نے بیٹے سے لپٹ کر روتے ہوئے اسے اتنے نقصانات کی خبر دی۔ وہ یونہی دم سدا دھکے کھڑا رہ گیا۔ اس میں اماں کے لرزے تو جو کو تھا مگر کہہ سارا دینے کا بھی یارا نہ تھا۔

سے سکرائی۔

سیاہ چمکتے بالوں کی لٹیں رخساروں پر جھول آئی تھیں۔ دھیمے دھیمے قسم کے ساتھ وہ اسے دنیا کی حسین ترین عورت نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ عمر کو جھولا دیتے ہوئے شرارت سے اسے چھیڑنے کی غرض سے گلگتا نہ لگی۔

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشمی ڈوبنے لگتی ہے ہم بوجھ اتارا کرتے ہیں
تیور ڈیور ڈاکٹر سے پوچھو۔ دیکھو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بھلا۔“ اماں اسے جھنجھوڑنے لگیں۔

ڈاکٹر کے چہرے پر بکھری مایوسی اماں جان کو کھولانے لگی انہیں تو کچھ سنائی ہی نہ دے رہا تھا ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا۔

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشمی ڈوبنے لگتی ہے ہم بوجھ اتارا کرتے ہیں
تیور کی ساعوتوں اور بصارتوں پر دبیز دھند چھا رہی تھی۔ اماں نے نہیں سنا مگر تیور نے سن لیا تھا کہ ڈاکٹر انہیں ایک ناقابل تلافی نقصان کی خبر سنایا گیا تھا۔



موسموں کے اس ملنے اور جدا ہونے میں
جانے دل کا کیا رشتہ ہے
جب اک موسم دوسرے موسم سے ملے ہیں
جانے کیوں اس دل کے اندر
دور کہیں

پر

”مجھے کئی روز سے بڑے بڑے خواب آرہے تھے تیور میرا دل سوکھے پتے کی طرح ہر وقت لرزتا رہتا تھا۔“

اس نے سر جھکا کر اماں کو دیکھا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بچوں کی طرح بلک بلک کہہ رہی تھیں۔ اس کے ذہن کی سطح پر پیسے بڑی زور دار ضرب پڑی تھی۔ اسے یاد آیا۔ شہلا کئی روز سے وہموں کا ڈکار رہے تھے کئی تھی۔ ہر وقت بے نام سے اندیشے میں گھری رہتی تھی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے تیور اپنا نہیں کیوں..... میرا بچہ خیریت سے بھی آئے گا یا نہیں۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ اسے جھمک دیتا۔ پھر نرمی سے سمجھاتا۔
”اچھی اچھی باتیں سوچو۔ وہموں اور خوف کو جتنا سر پر چڑھاؤ گی وہ اتنا تمہیں گھیریں گے۔“
”میں کیا کروں؟ یہ خود ہی مجھے ہر وقت گھیر لیتے ہیں۔ تیور۔ اگر..... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو؟“

”شہلا ایسو نہ ٹاپک۔“ وہ سخت برہم نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ تب وہ اتنے زور سے کھلکھلائی کہ وہ ساری ناراضگی بھلا کر خود بھی ہنس دیا تھا پھر اس کا نازک ہاتھ مروڑتے ہوئے بولا تھا۔

”تمہیں کچھ نہیں ہونے کا۔ جو کچھ ہونا ہے مجھے ہی ہونا ہے۔“ پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔

جاں اب کے بچ گئی تو قمر عہد بھی یہ ہے
اب دل لگائیں گے نہ کسی سم تن کے ساتھ
وہ عمر کی فیذا رٹھا کر جھولے کی طرف بڑھتے بڑھتے اس طرف دیکھ کر شرارت

ایک چھنا کا سا ہوتا ہے
جیسے کچھ شے کے برتن
اک وحشی آواز کو سن کر
تم ہاتھوں سے چھوٹ گئے ہوں
چھوٹنے سے دو ریت گھر وندے
بننے بننے ٹوٹ گئے ہوں
بھٹی رات کا سناٹا کیوں
خوف رگوں میں بھرتا ہے
پت جھڑ کی دہلیز پر ٹھہرا
لحمہ کس سے ڈرتا ہے
وہ تو پورے جاند کی شب تھی جب اک تار اٹھاتا تھا
وہ تو بھری بہار کدن تھے جب تو مجھ سے بچھڑا تھا

اس صدمے نے گھر کی ساری رونقیں چھین لی تھی۔ تعزیت کیلئے آنے والوں کا
ہجوم بھی ختم ہوا تو ویرانی اور شدید ہو گئی۔ تیرو کیلئے تو جیسے ساری کائنات ہی بے رنگ و بونہو
کر رہ گئی تھی۔ وہ پہلے بھی کم گو تھا اب تو جیسے لوں پر قفل لگ گئے تھے۔
آفس سے آ کر کچھ دیر عمر کے پاس بیٹھا رہتا۔ اسے خاموشی سے تکتا رہتا۔ اس
میں شہلا کا کس ڈھونڈتا رہتا پھر یک دم گہرا کر اسے اماں جان کے حوالے کر کے خود کمرے
میں بند ہو جاتا۔

اور اماں اس کی اس حالت پر روتی رہتیں۔

”میرے بچے کی خوشیوں کو جانے کس کی نظر لگ گئی۔ اس کی ہستی ہستی زندگی کو

روگ لگ گیا۔“

”یہ سب شہلا بھائی کی وجہ سے ہوا ہے اماں۔“ ثمرہ کبھی کبھی دل کا بچھوٹا پھوڑ
جاتی۔ ”نہ وہ اس گھر میں آتیں نہ وقتی خوشیوں کے بعد ایسا اندہناک غم تیرو بھائی کی
زندگی میں آ کر ٹھہر جاتا۔ روگی ہو گئے ہیں وہ تو۔“
”خدا کا خوف کر ثمرہ! زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ کوئی اپنی خوشی
سے مری ہے۔ کیا اس نے ہستی مسکرائی زندگی کے خواب نہ دیکھے ہوں گے۔ عمر کو اپنی
آنکھوں کے سامنے جو ان ہوتے دیکھنے کی اس کی خواہش نہ رہی ہوگی۔ بس اللہ کو جو منظور
تھا۔“

”ادبہ۔“ وہ جھنجھلا کر وہاں سے اٹھ جاتی۔ دراصل دل اس کا بھی دکھتا تھا تیرو کو
دیکھ دیکھ کر۔ اور وہ اپنے سارے آنسوئیں کے پاس جا کر بھائی تھی شہلا کے خلاف جی بھر کر
بھڑاس بھی اس کے سامنے نکالتی تھی اور وہ چپ چاپ سنتی کبھی کبھی تائید بھی کر ڈالتی۔

بہر حال..... وقت خود ہی مہر مہر ہوتا رہا ہے۔ زخم دھیرے دھیرے مندمل
ہونے لگے تھے۔ بس، کس کی تھی جو دل کی تہوں میں رہ گئی تھی۔ جنہیں تیرو تنہائی میں
شدت سے محسوس کرتا رہتا۔ مگر اماں کی کوششوں سے یا پھر عمر کی وجہ سے بہل گیا تھا۔ آفس
کے بعد سارا وقت بیٹے کیساتھ گزارتا۔ چھٹی کے دن اسے اپنے ساتھ لیے گھومتا۔ اس کی
میٹھی میٹھی باتوں سے دل سیراب کرتا۔ اس کی شرارتوں پر ہنستا اور گھٹنوں اماں سے اس کی
باتیں کرتا رہتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھائی سال کا ہو گیا تو وہ اسے اسکول داخل کرانے کی فکر میں

پڑ گیا۔ ڈھیر سارے اسکولز دیکھ آئے۔

”اماں! اسے کون سے اسکول میں داخل کراؤں۔“ وہ الجھ کر اماں سے پوچھنے

لگتا۔ اس کے پاس اب سوائے عمر کے اور کوئی موضوع ہی نہ رہ گیا تھا۔ شرہ تو چڑ جاتی اسے عمر کے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ تھا بھی وہ شہلا سے ملتا جلتا۔
”منحوس جاتے جاتے اپنا کس جھوڑی میرے بھائی کی زندگی میں روگ لگانے کو۔“

”اوسر بیٹھو۔ اسکول بھی داخل ہو جائے گا، ابھی کون سا بڑا ہو گیا ہے۔“ اماں اپنے پاس اسے بیٹھنے کو جگہ دے کر بولیں اور عمر کو اپنی تسبیح دے کر ایک طرف بٹھا دیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

”عمر جتنا تمہیں پیارا ہے۔ اتنا مجھے بھی تم پیارے ہو۔ کیا بھول گئے ہو کہ میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ تم میرے بیٹے ہو۔ عمر کی طرح ہی پیارے۔ دلارے۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ تم بیٹے ہو تو میرا دل سیراب ہوتا ہے۔ تمہارا چہرہ مسرور ہوتا ہے تو میری روح شانت ہوتی ہے۔ مگر جب تمہیں اجڑا ویران دیکھتی ہوں تو سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے۔

دل دکھ سے شق ہو جاتا ہے ابھی تمہاری عمر بٹنے کیلئے کی ہے۔ پہاڑی زندگی پڑی ہے جو یوں نہیں گزارنے کی جس کا تم نے تہیہ کر رکھا ہے۔“

وہ بولتے بولتے رو پڑیں۔ تیمور کا دل لٹل ہو گیا۔ اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبایا۔

”میں بہت خوش ہوں امی! آپ کیوں خود کو پریشان کرتی ہیں۔ یہ دیکھیں میرا پائرٹز میرے ساتھ ہے اور۔“

”نہیں تیمور۔“ اماں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اولاد کبھی پائرٹز نہیں ہوتی۔ یہ زندگی کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ یہ بس نعتیں ہوتی ہیں۔ خوشیاں ہوتی ہیں ہمارا مستقبل اس

سے وابستہ ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے خواب ہماری انگلیں ضرور وابستہ ہو سکتی ہیں مگر یہ عمر بھر کا تنگی ساتھی نہیں ہو سکتی۔ زندگی گزارنے کے لئے ایک غم گسار۔ ایک محبت کرنے والے ہم سفر کی ضرورت ہوتی ہے جو قدم قدم پر ہماری تنہائیاں پریشانیاں ہمارے دکھ سکھ شیئر کرتا ہے۔“

وہ چپ چاپ سر جھکا کر رہ گیا۔ اماں کی بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ لمبی لمبی راتوں میں تنہائی کا احساس کسی عذاب کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ اسے کبھی کبھی ایسے ہی ساتھی کی طلب ہونے لگی تھی۔ جب وہ دن بھر کی تھکن لے کر آئے تو وہ اس کی تھکن سمیٹ لے۔

ایسے کیسے نرم ہاتھوں کے لمس کی تنہا جانگے لگی تھی جو سارا بوجھ اٹھا لے۔ وہ اس سے باتیں کرے۔ منے، روئے اور عمر کے مستقبل کے خواب اس کے ساتھ مل کر دیکھے۔

اس نے وہیں گاؤں کے سے فیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ”شمن اب بھی تمہاری منتظر ہے تیمور! اماں اپنا ہاتھ ہولے ہولے اس کے گھنے بالوں میں پھیرنے لگی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور ایک لخت جیسے بوجھ سارو چ پرست آیا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کے باوجود وہ آنکھیں نہ کھول پایا۔ بس دھیرے سے بولا۔

”کیوں کر رہی ہے وہ ایسا؟ بالکل پاگل ہے وہ۔“

”ہاں۔ پاگل ہی تو ہے۔“ فرنگ میں چیزیں رکھتی شرہ کے اندر سے ایک سرود قسم کی آہ نکل گئی۔ وہ بس تیمور کو دیکھ کر دوبارہ کچن میں چلی گئی وہ وہیں خاموشی سے کام کرتے ہوئے ماں بیٹے کی باتیں سن رہی تھی۔

اس نے کتنے رشتے مسترد کر دیئے ہیں۔ اب تو راشدہ (شمن کی امی) بھی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ تیمور مان جائے تو..... چلو تم اس شمن کی بچکا نہ ضد سمجھ لو مگر عمر کے لئے سوچو

اپنے لئے سوچو۔ میں بوڑھی کب تک ساتھ رہوں گی۔ اور ادھر شرہ کی بات بھی طے ہو چکی ہے۔ دو سال پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے اور وہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ اور مجھ میں دم نہیں کہ میں گھر بار سنبھال سکوں۔ مجھے بھی آرام چاہئے تیمور! ہو آ جائے گی تو مجھے بھی سہولت ہو جائیگی اور تمہاری زندگی بھی۔“

”اماں!“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جن میں سرخیوں دوڑ رہی تھیں۔ شدت کرب سے لب بھیچے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور دھیرے سے بولا۔

”ایک فیصلہ میرا تھا۔ آپ نے سر آنکھوں پر رکھا۔ اب ایک خواہش آپ کی ہے میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“

اس نے ایک گہری سانس بھری وہ بامشکل مسکرا رہا تھا مگر اس کی مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔ اس نے اماں کا ہاتھ تمام کر لیوں سے لگایا۔

اماں تو خوشی سے نہال ہو گئیں۔ بے اختیار اس کا چہرہ تمام کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ادھر شرہ بھی خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اور بچن سے نکل کر شن کی یہ خوش خبری سنانے فون کی طرف دوڑ پڑی۔

شن اس گھر میں آخر کار بہو کے روپ میں ہی آ گئی اور دو سال بعد شرہ اس گھر سے وداع ہو گئی۔

شرہ کی شادی سے مہینہ بھر پہلے فہد کی پیدائش ہوئی تھی۔

گورے چنے فہد کو دیکھ کر شرہ تو نہال ہو گئی۔

”باں یہ بے میرا اصل بیٹیجا۔“ اس نے کہا تو اماں نے اس کی پشت پر ہاتھ جڑ

ڈیا۔

”اصل اور نقلی کیا ہوتا ہے۔“

”اصل یہ کہ ہمارے خاندان کا معلوم ہوتا ہے، خوب گورا چٹا بالکل اپنی امی پر گیا ہے اور مجھ سے بھی ملتا ہے۔ ہے نا۔“ وہ اسے گود میں اٹھائے تبصرہ کرنے لگی۔ اور شن بیڈ پر سفید چادر میں اوڑھے تقاضے پر بیٹھی دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔

تیمور بھی بیٹے کی ولادت پر خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ عمر کی گود میں فہد کو ڈالتے ہوئے بولا۔

”یہ دیکھو پانزہ۔ تمہارے لیے چھوٹا سا کھلونا آ گیا ہے تم اس سے اب کھیلنا۔“

”ارے واہ۔ میرا بیٹا کھلونا کیوں ہونے لگا۔“

شن نے جھٹ سے عمر کی گود سے بیٹے کو کھینچ لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

”آپ کا بیٹا ہوگا اس کے لئے کھلونا۔ یہ تو شہزادہ ہے میرا۔“ وہ عمر پر ایک نخوت

بھری نظر ڈال کر بولی تو تیمور کی پیشانی حکمن آلود ہو گئی۔ تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔

وہ شن کی عمر سے نفرت محسوس کر رہا تھا بلکہ اب تو فہد کی پیدائش کے بعد اس کی

نفرت شدت سے ظاہر ہونے لگی تھی اور اس میں شرہ بھی شامل رہتی تھی۔

وہ جب بھی میکے آتی اس کی تمام توجہ کا مرکز فہد ہی ہوتا۔ وہ بھول کر بھی عمر کا نہ

پوچھتی نہ اسے پیار کرتی۔ فہد کے لئے ہی چھوٹی موٹی چیزیں لے کر آتی۔

”آج میں احمر کے ساتھ گئی تھی یہ سوئٹر سوٹ پسند آیا میں نے فہد کے لئے لے

لیا۔ اس پر یہ رنگ بہت کھلے گا بھی۔ ہے بھی تو شہزادوں جیسا۔“ وہ جیسے عمر کو سنانے کو بخوتی

اور ادھر اماں اس کی اس پکڑنا ذہنیت پر کھس کر رہ جاتیں۔ مگر شرہ کے دل رکھنے کے خیال

سے اسے اب زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کرتیں چونکہ شرہ کے لگا تار دو بچے ضائع ہو چکے تھے۔

اس کی شادی کو تیرا سال لگ رہا تھا اور وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔

سواس وجہ سے تیمور بھی اس کی باتوں کو اس کا عمر کو نظر انداز کر دینے کا نوٹس نہ

لیتا۔ نہ اسے سرزنش کرتا۔

پھر چوتھے سال ٹھہرہ کو بڑی خوشی ملی اس نے ایک بڑی موٹی سی بچی کو جنم دیا جس کا نام عینید رکھا گیا۔ سب کو ہی یہ بڑی پسند آئی تھی جنم نے تو صحت سے اسے اپنے ہند کے لئے مانگ لیا۔

اماں نے کچھ برا مانایا۔

”ہند کیوں؟ عمر بڑا ہے۔“

”نہیں اماں! ہند میرا بیٹا ہے اور یہی میرا دادا بھی بنے گا۔“ ٹھہرہ بھی شرم کی حمایت تھی۔ عمر کے لئے اس کے لہجے میں کوئی محبت، کوئی نرمی نہ تھی۔ اماں چپ سی رہ گئیں وہ کیا کہہ سکتی تھیں۔ نہ بیٹی ان کی تھی نہ بیٹا۔ ہاں وہ ان دونوں عورتوں کی ذہنیت پر دھکی ضرور ہو جاتیں اکثر و بیشتر وہ تیمور سے کہتی رہتیں کہ وہ شرم پر سختی کرے کہ وہ عمر کا بھی خیال رکھا کرے۔ اسے نظر انداز نہ کرے۔ مگر تیمور کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا تھا کہ وہ ان معاملوں میں خود کو الجھائے۔ اس نے تو جیسے خود کو کاروبار میں گم کر لیا تھا۔ کبھی اماں سختی سے کہتی تو وہ جڑ کر کہہ دیتا۔

”یہ آپ ہی کی پسند کی بہو ہے۔ جس میں بقول آپ کے ہر خوبی ہے۔ اس نے مگر سنبھال لیا ہے اماں۔ بس یہی چاہتی تھیں نا آپ۔“
اور اماں اسے دل گرفتگی سے دیکھ کر رہ جاتیں۔
زندگی رواں پانی کی طرح گزرتی رہی۔

”دلوں میں محبتیں سٹ گئیں اور نفرتوں کی خود رو جھاڑیاں اپنی جڑیں پھیلاتی رہیں۔ اور آج اور آج ایک تاریک ویران خوف ناک جنگل نظر آ رہا تھا۔ جس نے عقل سلب کر لی تھی۔ اپنے زیاں اور زوال کے احساس سے بے پروا کر دیا ہے۔ بے حس، تنگ

دل کر دیا ہے۔“

اماں جان کی گہری سانس سینے کی تہہ سے خارج ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں ماضی کے حوالے سے نمی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ادھر ٹھہرہ کے بہتے آنسو بھی ٹھہر گئے۔ اس نے لاؤنج کے صوفے پر سر نکائے نکائے اماں کی آواز میں آنسوؤں کی نمی واضح محسوس کی۔ پھر ایک گہری پر ملال سانس بھر کر جیسے خود بھی ماضی کی کھاڑی سے نکل آئی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دروازہ کھول کر اس کمرے میں جائے۔ بیٹی سے نظریں ملائے۔ پہلے ہی وہ شرمسار تھی اب تو سارا ماضی اس کے سامنے بھی کھل چکا تھا۔
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مضطربانہ انداز میں ٹپٹپٹے لگی۔ پھر کسی خیال کے تحت فون کی جانب بڑھیں دوسرے پل وہ عمر کے آفس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔



”لیس..... عمر اسپیکنگ!“ عمر کی گمبھیر آواز اڑ چیں سے ابھری۔
”ہیلو۔“

”ہیلو پلیز۔“ مسلسل خاموشی پر اس نے ذرا سا چونک کر ریسیور کو دیکھا تب اسے ہلکی سی سانس کی آواز سنائی دی پھر شرہ کی آواز ابھری۔
”میں شرہ بول رہی ہوں عمر۔“ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی جیسے وہ کہیں دور خلاء سے بات کر رہی ہو۔ یہ دھیمہ انداز ان کی دل شکستگی کی غمازی کر رہا تھا۔
”ہیلو، ہیلو، عمر میں شرہ بول رہی ہوں۔“

انہوں نے اب کے ذرا اونچی آواز میں کہا مگر دوسری طرف لائن میں گہری خاموشی تھی پھر ریسیور کے رکھنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ گویا عمر نے ان کی آواز سننے ہی

ریسورر رکھ دیا تھا۔ وہ ان سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی اور بے چارگی آمیز کرب کے ساتھ وہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہ گئی۔ پھر خود بھی ریسورر کی ریل پر ڈال دیا۔

عجیب بات تھی سکی اور اہانت کے احساس کی بجائے بے بسی اور لا چاری محسوس ہونے لگی تھی۔

اضطراب اور تمکین روح پر آبلے کی طرح ٹپکنے لگی تھیں۔ نگاہوں تلے عینہ کا پھیکا زرد اور آنسوؤں سے تر چہرہ گھومنے لگا۔

شدت کرب سے انہوں نے آنکھیں موند لیں جیسے درد سے پھٹنے سر کو سنبھال دینا چاہا ہو۔



اماں جان کے خاموش ہو جانے کے بعد کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ عینہ کی نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ اس کا ذہن خالی اور کسی حد تک ماؤف ہو رہا تھا۔

اعصاب پر یوں سناٹا طاری تھا جیسے ہوا سے محروم چاند پر ہوتا ہوگا۔ اماں نے اس افسردگی کے بحر میں جکڑے جکڑے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر زنی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”میں عمر کو سمجھاؤں گی۔ تو فکر نہ کر۔ وہ میری بات ضرور مانے گا۔ وہ مفتاح مزاج نہیں ہے۔ اس نے یہ سب کسی انتقام لینے کیلئے نہیں کیا۔ وہ تو یوں بھی ابھی شادی کے لئے راضی ہی نہیں تھا۔ میں ہی اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ اب اسے سمجھاؤں گی، بھلا اتنی پیاری لڑکی کے لیے وہ کیسے انکار کرے گا۔“

اس نے شدت کرب سے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں جکڑ لیا اور بھیگی بھیگی پلکیں موند لیں۔

محبت کوئی خیرات تو نہیں ہے جسے کہہ رہو دو دروازے کی چوکت پکڑ کر مانگ لیتیں۔

وہ سکھ تو نہیں ہے جسے کہہ سکھول بروحا حاصل کر لیتیں۔

نانو کتنی نادان ہیں۔ اس کی خوش فہمیوں کی تو چادر کا ٹانگا ٹانگا ادھر چکا تھا۔ اب وہ نئے سرے سے ایسی کوئی چادر بننے کی سکت کہاں رکھتی تھی۔

محض مسکراہٹ کو محبت سمجھ لیتا۔

تھانے والے ہاتھ کو عمر بھر کا سہارا سمجھ لیتا۔

لحلوں کی خوش گوار رفاقت کو دائمی سمجھ کر خواب بن لینا۔ ”زنی خوش فہمیاں اور نادانیاں ہی تو تھیں اس کی۔ ایمن علوی جج کہتی تھی۔“ محبت میں جنوں خزیاں ابھی نہیں

ہوتیں۔ طوفان آخر کار طوفان ہی ہوتا ہے اس کی تہہ میں جا بیاں بنی کئی ہوتی ہیں۔“

”عینہ میری بچی، اپنی ماں کو معاف کر دینا۔“ اماں جان کی آواز میں آنسوؤں کی یورش تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں، پھر بے اختیار سر نانو کی گود میں ڈال دیا اور بلک اٹھی اور

اتنا روئی اتنا روئی کہ بدن کا پٹنے لگا۔ مجھ سے یہ سب کیوں چھپایا گیا نانو۔ میں نادان اور کم سن تو نہیں تھی۔ مجھے کیوں نہیں بتایا گیا کہ عمر شرم آنٹی کے بیٹے نہیں ہیں۔ اور.... اور یہ کہ

مجھے بچپن سے فہد سے منسوب رکھا گیا تھا۔ وہ بچکیوں کے درمیان بولی۔

”ہاں شاید۔ یہاں ہم سے بڑی غلطیاں سرزد ہو گئیں۔“ اماں جان ایک گہری پر ملول سانس بھر کر رہ گئیں۔ انہیں لگا جیسے ان کے پاس تسلی دینے کے لئے الفاظ ختم ہو چکے

ہیں۔ یوں بھی اپنے جملوں اور لفظوں کی کم مائیگی کا احساس ہو تو الفاظ گرفت میں نہیں آتے، لفظ اندر ہی ٹھہر جاتے ہیں۔

دوسرے دن اچانک ایمن آگئی اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے خاصا شاک لگا۔

”عینہ! یہ..... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ اسے بخار میں پھٹکتا ہوا دیکھ کر اس نے شمرہ کی طرف دیکھا جو اسے زبردستی سوپ پلا رہی تھیں۔
 ”آئی! آپ نے مجھے بتایا نہیں، یہ کب سے بیمار بنے خدا خدا کر کے تو یہ بستر سے اٹھی تھی پھر لگ گئی۔“

شمرہ نے لب دانتوں میں دبالیے اور سوپ کا پیالہ ساڈ میز پر رکھ کر بیڈ سے اتر کر بیروں میں سلیپر ڈالتے ہوئے بولیں۔
 ”اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں تمہیں فون کر کے بتانے ہی والی تھی۔ بیٹھو تم اس کے پاس شاید اس کا دل بہل جائے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھا جو بڑی سردی لگا ہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی، پھر لگا ہوں کا رخ موڑ کر ایمن کو دیکھنے لگی جو اپنا شولڈر بیک ایک طرف رکھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

شمرہ کمرے سے جاتے جاتے دروازہ بند کر گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنے جی کا غبار اپنی ہمدرد دوست کے سامنے نکال لے۔ اور ایسا ہی ہوا کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں سنائی دیئے نکلیں۔ وہ مضطرب سی لای میں نکل آئیں۔

”کیسے لوٹاؤں تمہاری خوشیاں؟ کہاں سے واپس لاؤں تمہاری وہی چپکاریں مہکاریں؟“ وہ کرب سمیٹے کہیں کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کس منہ سے عمر کے پاس جاؤں؟ یہ آگ میری ہی تو لگائی ہوئی ہے جو آج وہ لوٹا رہا ہے وہ سب ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔ اس کے دامن میں میری طرف سے نفرت کے کانٹے بے گانگی ہی تو ڈالی گئی ہے اور آج..... آج وہ سب لوٹا رہا ہے تو وہ سفاک اور ظالم لگ رہا ہے۔“

”خمن! تم نے اپنی نفرت اور محبت کے درمیان میری ہستی کو گھسیٹ لیا۔ مجھے

میرے اپنے خون، گھسے خون سے دور کر دیا۔“ اماں کہہ رہی ہیں وہ منقسم مزاج نہیں ہے۔“ ہاں بھلا اس کی ماں کب منقسم مزاج تھی۔

اس نے کب پلٹ کر میری زہر بھری باتوں کا جواب دیا تھا۔ بلکہ اس نے تو میری نفرت کا جواب بھی محبت سے دیا تھا۔

انہیں یک دم شہلا یاد آئے گی۔ اس کی اچھائیاں، خوبیاں اب دکھائی دیں گی۔ ان کا دل غیر شعوری طور پر شمن اور شہلا کا موازنہ کرنے لگا تو انہیں شہلا کا پلڑا ہر لحاظ سے بھاری لگا انہیں آج احساس ہوا کہ تیور نے واقعی ایک ہیڑے جیسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے خلوص اور محبت میں گندھی ہوئی لڑکی سے محبت کی تھی اور بھلا ایسی چاہنے والی پر خلوص رفیق کو کون بھلا سکتا ہے۔

آہ..... وہ آج ہوتی تو ضرور عمر کو راضی کر لیتی۔ ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے وہ اماں جاگلی بات مان لے۔“

امید کی کرن ان کے دل کے گوشے میں جھلگئی۔ ماپوی اور دکھ کے دبیز اندھیرے میں یہ چھوٹی سی ”کرن“ بھی بہت بڑا سہارا تھی۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے سر نکا کر دل میں دھیر ساری دعائیں مانگ لیں۔



ادھر ایمن کے علم میں ساری صورت حال آئی تو رنج سے اس کا دل شق ہو گیا۔ عینہ کی اجڑی صورت نے اس کے دل کو دکھ سے جکڑ لیا۔

اس نے ابھی اور اس وقت عمر سے بات کرنے کی ٹھانی تو اس نے اسے روکا۔

”نہیں ایمن، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ سب میری ہی نادانیاں اور خوش

فہمیاں تھیں۔“ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا مگر ایمن مانی نہیں۔

”صرف ایک بار بات تو کرنے دو۔ اس کے انکار کے چچھے کیا جواز ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے عینیہ کہ وہ محض تماشا شاعری ہو۔ اس کی طرف سے بہر حال تیل تو چھڑکا گیا ہے۔“ ایمن نے اس کے تان تان کرنے کے باوجود عمر کے آفس کا نمبر لیا اور فون سیٹ کے ساتھ صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ایک موہوم سی امید نے پھر دل کے اندر کے دیوار اندھیرے کو کاٹنے کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔

ایک بے چارگی آئیز کرب کے ساتھ بیڑی پشت سے لگ کر آنکھیں موند لیں۔ فون عمر نے ہی ریسو کو تھا مگر اجنبی آواز پر ذرا حیران ہوا تب اس نے تعارف کرایا۔

”میں ایمن علوی ہوں عینیہ کی بیسٹ فرینڈ۔“ اس نے بیسٹ پر زور دیا تھا۔ ”اوہ۔“ اس کے ہونٹ غیر محسوس طور پر باہم جھجھک گئے۔ اس نے ریسو کو ایک نظر دیکھا مگر خاموش رہا۔ تب وہ بولی۔

”عینیہ کے منع کرنے کے باوجود میں نے آپ کو فون کیا ہے کیا آپ اس کی حالت سے واقف ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے عینیہ پر نظر ڈالی جو ابھی تک آنکھیں موندے ہوئے تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔ کیا ہوا اسے؟“ دوسری طرف انتہائی انجان بننے کا مظاہرہ ہوا تھا یا حقیقتاً لاعلم تھا؟ ایمن سمجھ نہ سکی تاہم اسے غصہ بہت آیا اس کی اس مصنوعی یا حقیقی لاعلمی پر۔

”یہ کیسے ممکن ہے عمر صاحب کہ وہ اس بچ پر آنکھیں پھینکے اور آپ بے خبر ہوں آپ تک آنکھ نہ پھینچی ہو۔“ وہ استہزاء سے ہنسی تھی۔ عمر کو یک دم اپنی کپٹیوں پر شعلہ سا لپکتا محسوس ہوا۔ تاہم وہ غصے کے اس ابال کودا بتاتے ہوئے رسانییت سے بولا۔

”مس ایمن۔ اول تو میں اپنے پرسنل معاملے میں کسی غیر کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔“ وہ غیر پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”اور دوم یہ کہ آپ کی ایملی کی نادانیوں میں حصہ دار ہرگز نہیں ہوں کسی کو چاہنا ذاتی فعل ہے اس سے کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔

اب یہ اس کے اپنے خواب تھے۔“

”مگر ان خوابوں میں آپ نے کچھ تو رنگ بھرے ہوں گے وہ نادان تھی تو آپ نے اسے روکا نہیں حالانکہ یہ آپ کا اخلاقی فرض بھی تھا وہ کسی قدر نرم آواز میں بولی۔ وہ محض عینیہ کی خاطر نرم لہجہ اپنائے ہوئے تھی ورنہ اس کی حالت کے پیش نظر اس کا تو دل چاہ رہا تھا ہم بن کر اس شخص پر بلاست ہو جائے اور اس کے پرچے اڑا دے۔

اس کی بات سنی تھی عمر کے اندر اضطراب کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ایک ضرب سی پڑی تھی اعصاب پر۔ وہ ہونٹ جھنجھک کر ہلکی سانس خارج کرتے ہوئے دفاعیہ انداز میں بولا۔ ”میں نے کہا نا کسی کو چاہنا پسند کرنا ذاتی فعل ہے اس حق سے بھلا کو کسی کو دست بردار کر سکتا ہے۔“

”مگر آخر کی کیا ہے عینیہ میں کہ آپ نے اسے رد کیا ہے؟ اس کی بے لوث چاہت کو نظر انداز کیا ہے اور۔“ ایمن ایک دم پھٹ ہی پڑی۔ تب عینیہ لپک کر آئی اور اس کے ہاتھ سے ریسو کو چھین لیا۔

”پلیز ایمن۔ بس کرو۔ مجھے اس کی نظروں میں اتنا تو مت گراؤ۔ میں تو خود اپنی نظروں میں بھی گر چکی ہوں۔“

ایمن نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر ریسو کو بیڈل پر رکھ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔



وہ آفس کی ریلوے گجیٹر پر بڑی کسل مندی سے بیٹھا ہوا تھا۔ فائل اس کے

مانے کھلی پڑی تھی۔ اس میں پن کی صفحہ جھپکے کی ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے مگر اس کا ذہن ان صفحہ سے کہیں زیادہ منتشر اور مضطرب تھا۔

ریسور رکھنے کے بعد وہ خالی ذہن فائل پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ اس میں لکھے الفاظ بے مقصد لکیروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ دل خش خش کا رہا تھا اور یہ کیفیت اس کی کوئی بے منتہی بھرتی تھی۔ وہ مسلسل بے نامی خش اور اضطراب میں مبتلا تھا۔

اس کا خیال تھا جو سر اسر غلط تھا کہ وہ اپنے دل پر رکھا ہوا بوجھ اتار چکا ہے اور بہت خوش ہے۔ شمرہ کا تاریک پڑتا چہرہ اس کی پشیمانیوں اسے سرور کر رہی تھیں۔

وہ فاتح ہے اور فاتح کیلئے یہ طرح ہی شاد اور مطمئن ہے۔

مگر.....

طمانیت مسرت اسے تو نہیں کہتے۔

یہ کیسی طمانیت تھی جو اسے دل میں یوں چھو رہی تھی جیسے کوئی چھوٹا سا کانٹا اندر تازہ گیا ہو اور مسلسل کھٹک رہا ہو۔ مسرت ایسی وحشت ناک اور مضطرب احساس کا نام تو نہیں جس سے تاحال وہ گزر رہا تھا۔

اس نے فائل بند کی اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

اسے اچانک کمرے میں جس کا احساس ہونے لگا۔ حالانکہ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہاں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ اے۔ بی جی اس نے کچھ دیر بعد بڑھتی ٹھنڈ کی وجہ سے بند کیا تھا مگر..... کیا کرتا اس جس کا جو اندر تھا بے حد بے حساب۔

وہ سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑانے لگا۔ شاید اس طرح ذہن پر چھائی دھند چھٹ جائے یا اپنی سوچوں کے حصار سے وہ نکل سکے۔

باہر ٹریفک کا جھوم تھا۔ گاڑیوں میں ڈورتے فٹ پاتھ پر چلتے لوگ اپنے آپ

میں مگن زندگی کی دوڑ میں ایک بہتر زندگی حاصل کرنے میں سرگرداں دکھائی دے رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی زندگی سے شاد اور مطمئن نظر آ رہا تھا یا جھٹکیا۔ اس کا اپنا خیال تھا۔ اس وقت ہر شخص اسے اپنے آپ سے زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

چونکہ اس کی بے گلی حد سے سواتھی اور وہ خوشنہیں جان پارہا تھا کہ وہ اب چاہتا کیا ہے؟ اس اضطراب مسلسل کا تریا کیا ہے؟ وہ گھر آیا تو شمرہ پر نگاہ پڑی۔ وہ اماں کے ساتھ لابی میں ہی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

اندر ہی اندر کی جان بوجھنا احساس کا لگنے لگا۔ وہ نگاہوں کا زاویہ بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگی جب کہ وہ اماں جان کو سلام کر کے اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

”آپ بات کریں نا اماں۔“ شمرہ اس کے جاتے ہی دبے لہجے میں اماں سے بولی۔ اماں نے تسبیح ایک طرف رکھی اور چائے کا گلگ اٹھالیا۔

”رات تیمور نے اس سے بات کی تھی مگر وہ نہیں مانتا اب بھلا میرے پاس کون سا جادو ہے جو وہ مان جائے گا۔“

شمرہ نے بے جا رگی آمیز کرب سے لب دانٹوں میں دبا کر رہ گئی اور سامنے دیوار کو گھورنے لگی۔

”سنجھل جائے گی وہ۔ تو خود اوقات گزر جانے دو۔“ اماں ڈھارس دینے والے لہجے میں بولیں تو وہ گہری سانس بھر کر نفی میں ہلائے لگی۔

”نہیں اماں! اعینہ کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بے شک وہ چپ سا دھ لے گی مگر اندر سے ٹوٹ جائے گی، بکھر جائے گی۔“

”تو یہ سب تو تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا۔“ اماں جان نے ترچھی نگاہیں اس پر ڈالیں تو بوجھنا انداز میں سر جھکا کر رہ گئیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں

”میں بات کروں اس سے؟“ اس کے لہجے میں اتنا بھی تھی۔ وہ ساری نفرت حقارت جانے کہاں جا سوئی تھی۔ اس وقت تو وہ ایسی بھکاری معلوم ہو رہی تھی جسے ہر حال میں اپنا کھٹکول بھرتا ہو۔

اولاد کی محبت نے برف کی طرف پھٹھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ پھوپھو“ بن کر نہیں ماں بن کر عمر کے پاس جانا چاہتی تھی ایک بیٹی کی ماں بن کر۔

”نہیں“ آج رہنے دو۔ وہ کچھ تھکا اور پریشان سا لگ رہا تھا۔ میں خود بات کروں گی۔“ انہوں نے اسے روک دیا پھر اسے اٹھتا دیکھ کر بولی۔

”کہاں جا رہی ہو؟ تیور آتا ہی ہو گا۔ رات کا کھانا کھا کر جانا۔ فہم چھوڑ آئے گا۔“

”نہیں پھر کبھی سہی۔“ وہ دانستہ دامن بچا گئیں۔ مگر کے اس کھینچے کھینچے ماحول میں انہیں اپنے جرم کا احساس شدید ہونے لگا تھا۔ ایک طرف بھادوچ شمن کا رویہ بھی ناقابل برداشت تھا۔ وہ اس سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی۔ وہ ساری محبت جو کبھی نظر آتی تھی اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اور شمن کا یہ رویہ شرمے کے لئے کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس کی خیر خواہ اس کی حمایتی اور ہمدرد ہی تھی۔ مگر آج اس پر پڑی تو اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ جیسے سراسر قصور وار وہی اکیلی ہو۔ جب کہ نفرت کا پہلا بیج تو اس کے اندر بھی خود شمن نے ہی بویا تھا شہلا کے خلاف..... اور پھر عمر کے خلاف۔

وہ غمزدہ حال قدموں سے وہاں سے چلی آئیں۔



آج کئی دنوں بعد وہ کان ل آئی تھی۔ ایمن اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ یہ سب اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

وہ چند دنوں میں ہی کئی مہینوں کی بیمار نظر آئے گئی تھی۔ ایمن کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے زندگی کی رونقوں کی طرف پھر کھینچ کر لانا چاہتی تھی جس سے وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اسے لان میں بٹھا کر برگر لینے لگی اور جب واپس آئی تو وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

”عینیہ! اس طرح دل جلانے سے کیا حاصل۔ اس سے تو یہ بہتر ہے تم اس سے دو ٹوک بات کر لو۔“

”کیا بات کروں؟ وہ تو اسے میری نادانیاں سمجھتا رہا ہے۔“ اس نے بیگ کے اوپر ہی خانے سے ٹشو نکالا اور آنکھیں پونچھنے لگی۔

اک جان سوز نامراد خلش

اس طرف ہے ادھر نہیں ہوتی

وہ بے چارگی سے ہنس پڑی۔ پھر اس کے ہاتھ میں پیکٹ دیکھ کر بولی۔

”یہ کیا اٹھا لائی ہو۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔“

”مجھے معلوم ہے آپ کی بھوک اور نیندیں سب اڑ چکی ہیں مگر ڈیڑہ..... کتنے دن بھوکی رہ سکو گی تم؟“

ایمن نے اس کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا اور پیکٹ کھول کر ڈسپوزل پلیٹ میں اس کا برگر رکھ کر اس کے آگے کر دیا۔

”بات بھوک کی نہیں“ طلب کی ہے اور اس وقت مجھے بالکل طلب نہیں ہو

رہی ہے۔“ اس نے دوبارہ گھٹنوں میں سر دینا چاہا کہ ایمن نے اس کا سر اونچا کیا اور

آنکھیں دکھائیں۔

”اچھے دوست بھی نصیب والوں کو ملتے ہیں نا قدری پھر تمہیں ہی شکوہ ہو گا کہ

دوستوں نے بھی دل داریاں چھوڑ دیں۔“ وہ ہنسی۔ ”اور سنو کیا تم اس شخص کے لئے مجھے بھی چھوڑ دو گی۔ مجھے بھی خفا کر دو گی۔“

اس نے تڑپ کر اسے دیکھا، پھر بے بسی سے ہونٹ بھیج کر دیوار سے پشت لگاتے ہوئے بولی۔

”یہ جذباتی بلیک میلنگ ہے ایچی۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔ ایمن ہنس پڑی اور اس کی پیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں زبردستی پکڑا دے ہوئے بولی۔

”جذباتی بلیک میلنگ بھی تو ہیں کام آتی ہے جاہاں اپنائیت ہو۔ جذبوں کو سمجھنے والا محسوس کرنے والا اور قدر کرنے والا ہو۔ چلو شاہاش، تم تو اسکا کھالو۔ مجھے پتا ہے تم نے ناشتا بھی نہیں کیا سڑی چائے پی کر گھر سے نکل آئی ہو اور اب جا کر لٹچ بھی نہیں کر دو گی۔“ وہ اس کے آگے ہار گئی اور طلب نہ ہونے کے باوجود محض اس کا دل رکھنے کو کھانے لگی۔

”سنو میری ماں تو اس سے ایک بار مل لو۔“

”کیا کیا گی اس سے؟“ اس نے اضطرابی انداز میں سوال کیا۔ دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا ”تیو رولا“ جانے کو اور اس تم گوا کو ایک نظر دیکھنے کو۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے“ اس کا دل وہاں جانے کا سوچ کر ہی معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔ ذہن اکسانے لگا۔

”اب یہ بھی میں ہی بتاؤں کہ کیا کہو گی۔“ ایمن اسے گھور کر دیکھتے ہوئے مصنوعی خفگی سے کہنے لگی۔ ”میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ جاتے ہی ہم کی طرح پھٹ پڑو۔ اس کے خوب لتے لو اور.....“ ایمن نے دانت یوں پیسے جیسے دانتوں تلے عمر تیر رہی آ گیا ہو۔ وہ اس کی کیفیت پر دھیرے سے مسکرا دی۔

وہ اسے کیا بتاتی کر اسے دیکھ کر اسے جانے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ دھوپ میں رکھی برف کی طرح پگھل کر رہ جاتی ہے۔ اس کے ظلم میں جکڑ کر اس کے الفاظ کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ شاید اس کی آنکھوں کی خوب صورت چھیلوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

تم نے دیکھیں ہیں وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ زندگی جس کے تصور میں لٹا دی ہم نے تم پر انھیں ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں تم کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے ”ہو سکتا ہے عینہ“ وہ تمہارا الاشوری طور پر منتظر بھی ہو۔

ایمن کہہ رہی تھی اور اسے اپنے رگ و پے میں ایک نئی توانائی سرایت کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس نے بس ایمن کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اندر ہی کہیں امید کے دیپ مل اٹھے تھے۔



بارش کی یونندیں بے داغ شیشے پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ بہت ہلکی ہلکی یونندیں ہوا کے ساتھ صبح سے جاری تھیں۔ اس نے کھڑکی کا ہٹ پورا کھول دیا۔ اسے بارش سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ وہ کیسٹ پیلیر سے نکلنے والی اس غزل کو دلچسپی سے سن رہا تھا جو شاید کسی ملازمت کے کوارٹر سے آرہی تھی۔

دشت تنہائی میں، اے جان جہاں عرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
انھر ہی پسے قربت سے تیری سانس کی آغ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تیری دلدار نظر کی وہ شبہم
اس کا دل چاہا وہ اس آواز کو تیز کر دے اتنی تیز کہ اس کے اندر کا وحشت ناک
شور دہ جائے۔ اس کے دل سے اٹھنے والی آوازوں کا دم ٹوٹ جائے۔
اس قدر پیار سے، اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ابھی صبح فراق
ڈھل گیا، بھر کا دن، ابھی گئی وصل کی رات

اسے لگا غزل کے بول اسکے اندر کی وحشت کو اور بھی ہوادے رہے ہوں۔ ایک
عجیب سی افسردگی نے اس کے دل کے گرد جال سا مین لیا تھا اسے یہ کیف آگئیں ماحول یک
دم اداس اداس لگنے لگا۔

بھینکے بھینکے سبز پتوں میں بھی حزن محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یاد تھا ایسے خوشگوار موسم
میں اس کا موڈ بھی خوش گوار ہو جایا کرتا تھا اور وہ فوراً ہی رنگ اور برش اٹھا کر کوئی شاہکار
تخلیق کرنے لگتا۔ آفس میں ہوتا تو وہاں سے بھاگ جانے کے چکر میں پڑ جاتا اور پایا
ہنس پڑتے۔

مگر آج یہی موسم اس کے اندر مرضیوں لگانے لگا۔ اسے یک دم ہلکی ہلکی سترن مہمی
کی جھنکاریں سنائی دینے لگیں اور اس نے جیسے آنکھیں موند لیں۔

بارش کو دیکھ کر وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر اس کی طرف دوڑتی تھی۔
”عمر بھائی، اف کتنا زبردست موسم ہو رہا ہے اور آپ یہ رنگ برش لے کر بیٹھے
ہیں۔“ وہ دروازہ دھاڑ سے کھول کر خراماں خراماں چلی آئی، شاید لان سے سیدھا نہیں آئی

تھی اس کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بیگنی ٹیئیں چہرے پر جھول رہی تھیں اور چہرہ
اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا۔ دو پلاس نے بڑے سلیقے سے جسم کے گرد پھیلا رکھا تھا۔
”ہاں میں انجوائے ہی کر رہا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا تو وہ منہ بنا کر
”ہنسی تھی۔“

”کمرے میں بند بارش کو انجوائے کر رہے ہیں آپ۔ جناب باہر نکل کر دیکھئے
کیا زبردست موسم ہو رہا ہے آئیں نا۔ فہد بھی لان میں بیٹھا کباہوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہے
اس سے پہلے کہ وہ سب چٹ کر جائے جلدی سے آجائیے۔“
”کباب کھانا چاہ رہی ہو یا بارش دکھانا؟“

وہ کھیا کر ہنس پڑی، اور اس کے ہاتھ سے برش چھینتے ہوئے بولی۔
”یہ تصور دھوپ میں بھی بن سکتی ہے۔ بارش ختم ہوگئی تو پھر مڑائیں آئے گا۔“ وہ
اس کے رنگ برش خود ہی ایک طرف رکھنے لگی پھرایزل پر پردہ گرا دیا۔ وہ ہونٹ سمیٹنے اسے
دیکھتا رہ گیا۔

وہ اس کی معصوم خواہشوں کا اگر کبھی احترام کر لیتا تو وہ بچوں کی طرح سرور ہو جاتی۔
اس کی ذرا سی توجہ اس کے اندر پھول کھلا دیتی۔
اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھتا۔

کوئی موسم بھی ہووے اس کے بناء انجوائے نہیں کر سکتی تھی۔ مگر آج.....
اس نے لان میں برسنے والی بوندوں کو دیکھا تو جیسے باہر کا سناٹا اندر تک اتر گیا۔
آج وہ کیوں دودھ کر نہیں آئی اسے بلائے کو؟

”عمر! بارش ہو رہی ہے اور آپ اندر گھسے بیٹھے ہیں۔ آئیں نا باہر۔ دیکھیں موسم
کتنا زبردست ہو رہا ہے آئیں پلیز۔“

وہ یک دم چونکا۔

دروازہ ہلکے سے کھلا تھا اور اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

”کمال ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم لان کے کسی گوشے میں اس خوش گوار موسم کو انجوائے کر رہے ہو گے مگر یہاں تو.....“

فہد اندر آچکا تھا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا اور دوبارہ رخ کھڑکی کی سمت کر لیا۔

ایک اکڑا میں ہی گھر میں خوف زدہ سا بیٹھا تھا وہ نہ شہر تو بھیگ رہا تھا۔ پہلی پہلی بارش میں ”وہ خوشی سے گنگنا تا۔“

”آج موسم واقعی اچھا ہے۔“ وہ گہری سانس بھر کر رخ موڑ کر فہد کی طرف دیکھنے لگا۔
”تمہیں لگ رہا ہے؟“ جواباً وہ ہولے سے ہنس کر ایک ابرو جھکا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے لہجے اور نگاہوں کے زاویوں سے وہ شپٹا گیا پھر کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ کی سائڈ پر بڑے صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

فہد اسے نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھا دھیرے سے بولا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“

وہ چونکا۔ ”کیا؟“

کہ تمہیں یہ موسم واقعی اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ اس کے سامنے اس کے بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہاں سے اس کے دل کے اندر جھانک رہا ہو۔

وہ شاید اس غیر متوقع صورت حال کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔ فہد کی نظروں میں چھپے سوالوں کو یک دم نظر انداز کر دیا۔

فہد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ایک طرح سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک گہری سانس بھر کر اس کے بیڈ کی شفاف چادر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے متاثرانہ لہجے میں بولا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا عمر۔ عینہ کے ساتھ۔“

عمر نے نگاہیں ہٹا کر بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا پھر نگاہوں کا زاویہ بدل کر سامنے کی دیوار کو گھورتا رہ گیا۔

اور دروازے کے باہر دھیرے دھیرے قدموں سے چلنے والی عینہ کے قدم وہیں ساکت ہو گئے۔ وہ ایسے کے پر زور اصرار پر تیمور والا آئی تھی۔ اس ستم گر کو دیکھنے کو گھر فہد کی آواز اور اپنے نام پر ٹھٹک گئی۔

اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اندر یکفخت چھا جانے والی خاموشی اس کے اعصاب پر ضرب کی طرح لگنے لگی۔ وہ کچھ اور قریب ہو کر دروازے سے لگ کر عمر کی آواز کی منتظر ہو گئی۔

کئی بل خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔

عمر کے چہرے پر کھنکھائی کی کیفیت سمٹ آئی تھی۔

”اگر یہ ماضی کے حوالے سے کوئی انتقامی کارروائی ہے تو.....“ فہد نے کہنا ہی چاہا کہ وہ ٹوک گیا۔

”شٹ اپ۔“ اس نے فہد کو سخت فہمائشی نظروں سے دیکھا تھا۔

”تم سب مجھے ہی کیوں پلیم کر رہے ہو۔ کیا جانتے ہو تم۔ صرف یہ کہ عینہ نے مجھے بند کیا اور میں نے اسے ری جینٹ کر دیا۔ اس کے علاوہ کیا جانتے ہو تم؟“ اس کی آنکھوں

میں سرخی لدا آئی۔ یوں بھی وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ اس کے اعصاب مثل ہو رہے تھے اور ذہن کی رنگیں تتی تتی سی محسوس ہونے لگی تھیں۔ فہد نے اسے بھڑکا ہی دیا تھا۔ اس کی طنائیں کھینچ لی تھیں۔

”میں کسی سے پسند کرنے کا حق نہیں جھین سکتا تھا“ اس کا دل نہیں بدل سکتا تھا اس کے احساسات اور جذبات میرے کنٹرول میں نہیں تھے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نگاہیں کترالیں۔ فہد کچھ ایسی مہمتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا پھر ذرا سا ہنسنا۔ اس کی ہنسی بھی استہزا تھی۔

”بے شک وہ جذباتی اور پاگل سی لڑکی ہے مگر یہ کیسے ممکن ہے عمر کہ ہمیں اس کی دیوانگی کا اندازہ ہو گیا اور تم بے خبر رہے۔ یہاں تک کہ وہ اسی بچ پر آگئی کہ واپس پلٹنے کا راستہ ہم کمر بیٹھی۔“

وہ کھڑکی سے باہر پھیلی دھند کو گھورتا رہ گیا کہ فہد مزید گویا ہوا۔

”تم اسے ضرورت سے زیادہ توجہ دینے لگے تھے اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا احترام کرنے لگے تھے۔ اس کی خوشیوں کو شیر کرنے لگے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کس جذبے اور کسی رشتے سے تمہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ تمہاری دائمی رفاقت کی طلب گار تھی“ یہ بات میں محسوس کر چکا تھا تو تم..... تم کیسے نہیں کر سکتے تھے۔“

”چپ ہو جاؤ فہد چپ ہو جاؤ“ اس کی رگ رگ میں آگ بھڑکنے لگی۔ اس نے زور سے کھڑکی کا پٹ بند کیا اور چورنگا ہوں سے فہد کو دیکھنے لگا جو متا۔ غمان نظروں سے گویا اسے چھید رہا تھا شاید اسے بھی عمر جیسے شخص سے اس طرح کے بی ہود کی توقع نہیں تھی۔

تب اس نے ایک گہری سانس بھر کر اپنے اندر سے اٹھتے ابال کر دباتے ہوئے بانوں میں انگلیاں پھنسا کر صوفے کی پشت سے سر نکالیا۔

”ہاں میں سب جانتا تھا“ میں نے خبر نہیں تھا بلکہ میں نے یہ سب جانتے بوجھتے ہی کیا ہے۔ اس کے واپسی کے راستے تم کینے میں اور یہ سب میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہے کسی جذباتی لگاؤ کے تحت نہیں۔“

”عمر“ فہد تھرا آئیر بے یقینی سے اسے متکا رہ گیا اس نے ہونٹ یک بارگی کٹے پھر اس نے ہونٹ کھولتے ہوئے سخت متاسفانہ لہجے میں کہا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ وہ ہلکے سے ہنسنا مگر اس کی ہنسی روح سے خالی تھی آنکھیں ایک لمحے جذموں نہ کھولیں تو ان میں نفرت آئیرنگی اندلی محسوس ہونے لگی۔

وہ اتنا اجڑا اور ویران دکھائی دینے لگا کہ فہد کے دل پر چوٹ سی پڑی تاہم وہ اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

کمرے میں چند لمحے بوجھل سا سکوت چھایا رہا پھر اس سکوت کو عمر کی آواز نے ہی چیرا تھا۔

”انا اور عزت پر لگنے والی چوٹ کچھ ایسی ہوتی ہے فہد کہ اس کی اذیت اس کی تملہائیں روح کو چھید کر بے قرار اور بے چین کر دیتی ہیں۔ میرے کردار پر کچھ اچھائی لگنی میرے ضبط کی وہ انتہا ہی تھی اور اس میں جس اذیت سے گزرا تھا یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔

میرے سارے جذبے ساری اچھائیاں بدصورتی میں بدل گئیں۔ میرے صاف ستھرے ذہن و دل میں گندگی انڈلی گئی دانستہ ایسا کیا جانتے بوجھتے میرے عمل کو آ زمایا گیا فہد میرے اندر کے متحمل مزاج انسان کو منتقم بنا دیا گیا۔ شرہ پھوپھو کا لگایا ہوا الزام میری رگ رگ میں نفرت بھر کر اٹھانے انسان سے شیطان کا روپ دھار لینے پر مجبور کر دیا اور آگ شرہ پھوپھو نے میرے اندر بھردی تھی میں نے اس آگ کو انتقام کی پھوار سے ٹھنڈا کرنے کی

”کوشش کی۔“

فیداس انکشاف پر بھونچکا رہ گیا۔

”انہوں نے الزام لگایا کہ میں ان کی معصوم بیٹی کو درغلا رہا ہوں۔ اسے فریب کے جال میں قید کر رہا ہوں اس کی معصومیت کا فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب پورا کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہ میں اس سے دور ہوں اور میں جو اس کی بیٹی کو کبھی اس نظر سے نہ دیکھا تھا وہ میری نظر میں ایک پاگل سی معصوم سی بچی کی طرح تھی اسی الزام نے میرے ضبط میں میرے پاکیزہ جذبوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ میں ماضی کو فراموش کر چکا تھا مگر حال کا الزام میری برداشت سے بہت زیادہ تھا میرے عمل کو ریہہ ریہہ کر دینے کیلئے کافی تھا۔“

وہ چپ ہوا تو کمرے میں یلکھت، ہسیا تک خاموشی چھا گئی۔

فیدہ کے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اس کی قوت گویائی اس اندوہ ناک انکشاف نے سلب کر لی تھی۔ عمر اپنی تلکٹی کنپٹیوں پر انگلیاں دبا کر آنکھیں موند چکا تھا اس کا دل نئے سرے سے انوکھی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور پردہ کھینچا مگر راہداری میں گہرا سکوت تھا۔ مگر اسے محسوس ہوا جیسے کوئی بہت سرعت سے راہداری عبور کر گیا ہو۔ وہ پلٹا تو فیدہ نے مستفہامیہ لگا ہوں سے دیکھا مگر وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر دوبارہ صوفے پر گر گیا۔

”عمر اب شک جو ہوا یہ نہیں ہونا چاہئے تھا تاہم....“ وہ گہری سانس بھر کر دم بھر کور کا پھر اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ سب کرنے کے بعد تمہارے اندر کی تپش ختم ہو گئی؟ تمہاری اتنا تکسین مل گئی ہے؟“

اس کا حملہ بڑا اچانک لگا وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا دل سخت قسم کی دل گرنگی محسوس کرنے لگا۔

”اگر طمانیت مل جاتی تو تم اتنے مضطرب.....“

”پلیز فیدہ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں اس موضوع پر اب مزید کوئی بات نہیں کر سکتا۔“ اس کا لہجہ درشت تھا۔ مگر فیدہ بات ہی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

”اگر انتقام لینے کے بعد تم خوش ہو تو میں بھی بہل جاتا مگر عمر ایسا نہیں ہے۔ تم اپنے اندر کو کٹھن لو شادی تم بھی انجانے میں اس راہ پر چلے آئے ہو۔“

”کارڈ سیک فیدہ۔ میں نے کہا نا مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں یہ باب بند کر چکا ہوں۔ میں بہت مطمئن ہوں۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو جائے مگر ابھی ایسا نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات پر ہلکے سے ہنسا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”انا کی جنگ میں جیتنے والے

نا آسودگی کے جال میں پکڑے نہیں رہتے۔

اس طرح بے سکون مضطرب نہیں رہتے۔

وہ اس کے صوفے سے اٹھنے سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا مگر اس کے ارد گرد وہی آگ بھڑک گیا جس میں وہ کئی دنوں سے جل رہا تھا۔



اس نے تیور دلا سے اپنے گھر تک کا فاصلہ یوں طے کیا جیسے ہزار کانٹوں سے الجھتی آئی ہو۔ کتنی محرومیوں کو سمیٹ کر لائی ہو سکتا تھا۔“

کائنات بھری گرنگی اور آرزو دہنگی کا بو جھلے کر پہنچی ہو یہاں۔

وہ تو اس تم گرو کو دیکھنے انگلوں کے ساتھ گئی تھی۔ اسے تو وہ بے گناہ بے تقصیر ہی لگا تھا مگر اب اس انکشاف نے اس کی ساری خوش فیہیوں کو اس بری طرح روند ڈالا کہ وہ مفلوج پرندے کی طرح ڈھلے گئی۔

اس کا دل چاہا وہ چیخ کر اتاروئے اتاروئے کہ دم نکل جائے۔

سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ اعصاب دکھنے لگے کہ ”اے محض انتقام کی بھنی کا ایندھن سمجھا گیا۔

اس کے معصوم بے غرض جذبوں کو چارے کے طور پر استعمال کیا گا۔
اس کے جذبوں سے کھیل کر درپردہ اس کی ماں سے انتقام لیا جا تا رہا۔
اس شخص کی توجہ۔

اس کی محبت۔

سب جھوٹی تھی محض ڈراما۔

شدت کرب سے کٹن اٹھا اٹھا کر دیوار پر پھینکنے لگی۔ اسے آج اپنا آپ اندر سے

بالکل خالی خالی اور دوران لگ رہا تھا۔

سب کچھ ایک بے درد ظالم سفاک شخص پر لڑا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔
چند خوش گوار لمحوں کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔

جو انگارے اس شخص نے برساتے تھے اس سے اس کی روح شاید عمر بھر سلکتی رہے

گی۔

اس نے تکیہ اٹھایا پھر اس پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے لگی۔

کاش..... کاش! عمر میں تمہارے فریب کے جال میں نہ آتی۔

تمہارے اندر کے شیطان کو پہلے ہی جان گئی ہوتی۔ کتنی بے مایا بے حقیقت ہو کر
رہ گئی میری ذات تم نے اسے صرف اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔

میرے پاکیزہ بے غرض جذبوں کو اپنی نفرت اور انتقام کی جھینٹ چڑھا دیا۔

امی کو نپچا کھانے کے لئے تم خود بھی پستی میں اتر گئے۔

تم، عمر، اتنی پستی میں بھی اتر سکتے تھے میں کیسے یقین کر لوں۔

اس نے سلگتی آنکھیں کھولیں پھر موند لیں۔

اسے اپنا دل آگ میں دھڑا دھڑا جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسے لگا کسی نے اسے بہت اونچائی سے نیچے پھینک دیا ہو۔

سارا بدن پتھر پتھر کی زمین پر گر کر زخمی ہو گیا ہو۔ اب کے بتا سکے گی کہ جسے خوشی کی
تفنی سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی ستارہ سمجھ کر اس کی طلب گار بن بیٹھی تھی۔ وہ تو دہکتا
ہوا انگارہ نکلا جو اس کی زندگی کو بھسم کر گیا۔

اسے عمر بھر کے لئے ذلت کی آگ میں دھکیل گیا۔



چھپ، چھپ کر کئی دن رونے کے بعد اس کے آنسو حقیقتاً خشک ہو گئے تھے۔
وہ ایسی اجڑی دکھائی دینے لگی تھی جیسے بھری بہار میں ہنستے مسکراتے پودے پر خزاں آگئی
ہو۔

تاہم وہ یہ سوچ کر اپنے دل کو ڈھارس دے رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا کہ عمر کا اصلی
روپ اس نے دیکھ لیا کم از کم اب وہ جی بھر کر اپنے انتخاب پر پچھتا تو سکے گی۔

آس و امید کا دامن چھوٹ جائے، نامرادی اور ناامیدی کی تاریکی دبیز ہو جائے
تو پھر انسان ایک دن بہل جاتا ہے۔ اندھیرے کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ وہ مانوس ہو
جاتا ہے اس اندھیرے سے۔ اس تیرگی سے۔

ڈوبتی ناؤ سے اچھا ہے ڈوب جانا۔ کم از کم ڈوب جانے کے خوف اور دھڑکے
سے نجات تو مل جاتی ہے۔

اس کرب انگیز اور راہنات آئینہ انکشاف نے اس کی ساری خوشیوں کو یوں چوس لیا
تھا جیسے آکاس بیل ہرے بھرے درخت کا پتا چتا چوس لیتی ہے۔ اسے اب اس سے

سر وہ کا نہیں تھا کہ اس کی زندگی کس طرح اور کیسے گزرے گی۔ اس نے امی کی گود میں سر رکھ کر بڑے تحمل سے کہہ دیا تھا کہ

”امی! مجھے آپ لوگوں کی خواہش منظور ہے۔ میں فہد کا رشتہ قبول کرتی ہوں۔

خمن! آئی سے میں شرمندہ ہوں اور آپ سے بھی..... اور شاید اپنے آپ سے بھی۔“

شمرہ نے تڑپ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور کچھ دیر دیکھتی رہیں پھر بے اختیار اسے

سینے سے لگا کر بچھڑ گیا۔

دو آنسو ان کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر اس کے گھٹے ریشمی بالوں میں

جذب ہو گئے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی خاموش نگاہوں اور چہرے کے تاثر نے

کچھ کہنے سے باز رکھا۔ وہ اس کے سینے سے الگ ہوئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

روڈ پر ایسی تھکن تھی جو اس کا خیال تھا اب تا عمر تازہ نہ کیگی۔

اس نے کھڑکی کے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھا اور گہری سانس بھر کر کھڑکی کے

شیشے سے لگ کر اندھیرے کو گھورنے لگی۔

وہ جس کو پیار کا مفہوم تک نہیں معلوم

اس کے در پہ ہی کیوں جان و دل لٹا بیٹھے

ہماری طرح سے اجڑا ہے کون زمانے میں

نہ تو ماہمیں، خود کو بھی ہم گنوا بیٹھے



وہ ابھی آفس سے اٹھنے ہی والا تھا کہ فہد اندر داخل ہوا اور سیدھا اس کی میز تک

آیا اور دونوں ہاتھ میز کی سطح پر ٹکا کر ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے اس انداز پر وہ ذرا سا چونکا۔

”خیریت... کوئی کام تھا کیا؟“ اس کی آمد اس کے لئے غیر متوقع ہی تھی۔ وہ بہت کم ضرورتاً ہی آفس آتا تھا۔ اس کے استفسار پر سر کو ہلکی سی اٹھاتی جنبش دی پھر ذرا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔

”ایک خبر سنائی تھی اسے خوش خبری سمجھ لو..... یا“

وہ پل بھر کو راس کا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے بولا۔ ”اصولاً تو

مجھے مضامی کے ہمراہ آنا چاہئے تھا مگر خیر مضامی تم گھر پر آ کر کھا لینا خبر مجھ سے سن لو کہ عینیہ

کے ساتھ میرا رشتہ طے پا چکا ہے اور اس آنے والے جمعہ کو منگنی ہے۔“

اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا دوسرے پل نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

فہد یہ خبر سنا کر اب اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

”تم نے غالباً کہا تھا کہ فہد کی خوشی میں اس کو سب سے پہلے گلے لگانے والا میں

ہی ہوں گا۔ فہد کے لبوں کی تراش میں دھیمی مسکراہٹ تھی نگاہیں اب بھی اس کے چہرے پر

جی تھیں پھر وہ پیچہ دیٹ گھماتے ہوئے بولا۔

”تمہیں یقیناً مسرت ہوئی ہوگی۔“

اس کا دل چاہا وہ فہد کو فوراً کمرے سے باہر کر دے اور خود آنکھیں موند کر سر میں

ایک دم اٹھنے والے در کو دو بانے کی کوشش کرے۔ مگر بس وہ فہد پر تر بھی نگاہ ڈال کر رہ گیا

اور دھیمے لہجے میں بولا۔

”تم خوش ہو اس سے اچھی بات میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ بھائی ہو میرے

تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔“

اس کے چہرے پر اب ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ حملہ بے شک اچانک تھا مگر اس کی

قوت ارادی بھی بلا کی تھی۔

میں اس کا ہو نہیں سکتا اسے ہونے نہیں دیتا

فہد نے کچھ ایسی ہنسی کے ساتھ بر جستہ کہا کہ وہ ہونٹ بھیچے اے بس دیکھتا رہ گیا۔ پھر خاموشی سے پلٹ کر آفس سے نکل کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ فہد بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”مسٹر عمر! کسی سیانے نے کہا ہے کہ ”آپ چند لوگوں کو ہر وقت بے وقوف بنا سکتے ہیں اور بعض لوگوں کو بعض وقت، مگر تمام لوگوں کو ہر وقت بے وقوف نہیں بنا سکتے اور سنو پلیز۔“ وہ چنپٹا رہ گیا مگر۔

مگر وہ بڑی سرعت سے ٹپن پیش کر دیا گیا تھا اور دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا جب کہ باہر رہ جانے والا فہد مضطرب بھیج کر رہ گیا۔



وہ سی گرین کا مدانی سوٹ میں فہد کے برابر بیٹھی تھی جب وہ لڑکیوں اور لڑکوں کے جھوم کم ہونے کے بعد مبارک باد دینے اسٹیج پر آیا تھا۔ فہد کو اس نے گلے سے لگا کر مبارک باد دی۔ فہد اسے شاک کی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ مگر وہ انجان بنا عینہ امر کی طرف چلا آیا۔

”بہت بہت مبارک ہو۔“ اس نے بو کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بڑے سے نشو کے دوپٹے میں تقریباً آدھا چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ یوں جیسے پتھر کی صورت ہو۔ حزن کی آمیزش نے اس کے چہرے کو اور بھی دل کش بنا دیا تھا۔ مگر اس کا حزن تو صرف محسوس کرنے والی آنکھ ہی محسوس کر رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھی مگر تو اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا کہ وہ ضبط کے نہ جانے کتنے سمندر پار کر کے یہاں بیٹھی ہے ایک آتش فشاں دبائے۔

فہد دل ہی دل میں اس کے اعصاب کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

مگر وہ لمحہ جو اس کے اعصاب کو لکھ بھر کے لئے ہی کبھی منتظر کر گیا تھا۔ اضطرابی کیفیت کا لمحہ اسے فہد کے سامنے طشت از باکرم چکا تھا۔ وہ اسے بڑی کھوجتی اور قدرے تسمخرازد نگاہوں سے نکتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”یقیناً میری خوشی تمہاری خوشی ہے۔ تم ہمیشہ سے فراغ دل رہے ہو۔ اپنی چیزیں بڑی خوشی سے میری جھولی میں ڈالتے رہے ہو۔ یاد ہے مجھے اچھی طرح، جب بچپن میں، میں تمہاری چیزوں پر حق جتایا کرتا تھا تو تم، بڑی محبت سے مجھے بہلانے کی خاطر اپنی قیمتی اشیاء بھی مجھے دے دیا کرتے تھے مجھ سے میرا دل رکھنے کو..... دادی ڈانٹتی کہ.....“

”پلیز فہد۔“ اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی اس گراس کی اٹھتی نگاہوں میں جانے کیا تھا وہ نگاہوں کا زاویہ بدلنے پر مجبور ہو گیا اور قدرے پست آواز میں بولا۔

”اس بے مقصد گفتگو کا مقصد؟“ وہ کرسی جھکیں کر کھڑا ہو گیا۔

فہد اسے بڑی دل گرفتگی سے دیکھنے لگا پھر ایک گہری سانس بھر کر سیدھا ہو گیا اور اس کے ہمراہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”اس بے مقصد گفتگو کا مقصد تھا بلکہ تمہیں سمجھانا کہ ہر وقت کی فیاضی اور فراخ دلی اچھی نہیں یہ کبھی کبھی عبرت بھر کیلئے اذیت بن جاتی ہے۔ انسان چیز نہیں ہوتے کھلو نے نہیں ہوتے، محبت بہت قیمتی شے ہے یہ کسی کونفہ میں بھی نہیں دی جاسکتی۔ چاہت سے کوئی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ دل میں رہتی آ لے کی طرح سلگتے پھوڑے کی طرح۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتے نکلتے کندھے اچھکا کر بولا۔ مگر فہد نے کچھ ایسی نظروں سے اسے گھورا کہ اس نے نگاہیں چرا لیں۔

میں اپنی انا کے ہاتھوں عجب بے بس ہوں یارو

عمر چند لمبے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے چاہنے کے باوجود لگاؤ نہیں نہ ہٹا سکا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے بو کے پلٹے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ لگاؤ ہوں کا تصادم ہوا۔ ان لگاؤ ہوں میں جانے کیا تھا اسے اپنے دل پر نامانوس سی آنچ پڑتی محسوس ہونے لگی۔ ایک دم اپنے اندر غلامی پن کا احساس ہونے لگا۔ سب کھودینے کا اذیت ناک احساس روح پر کچھ کے لگنے لگا۔ اضطراب رگ رگ کو چھیدنے لگا۔ وہ بو کے لئے کڑھنک پوکھ کر پھر چھٹی آواز مگر بڑے جیسے لہجے میں بولی۔

”کیا یہ اصلی پھول ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے لوکے ناک پر لے جا کر سوٹھا۔

”خوشبو مصنوعی پھولوں سے بھی کبھی کبھار آ جاتی ہے کہ انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی دھوکا ہی نہ ہو۔“

ایک افرادہ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بو کے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

فہد نکسری دونوں سے بے نیاز ہو کر اپنے دوست سے جو گفتگو تھا۔

عمر اس کی بات پر غصہ کیا۔ بے اختیار ہی اس کی طرف رخ موز کر دیکھا تھا۔ اسباب کو خفیف سا جھٹکا لگا تھا۔ اس کے چہرے سے تاثرات نے اس کی پیشانی کو چٹا دیا جیسے کوڑا کا تھیرا اسے چھو گیا ہو۔

”آپ تو یوں بھی خوب صورت دھوکے باز ہیں۔“ وہ بھاری خوش نما پلکوں کو اٹھا کر ایک ہلکی مگر جھپٹی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ کر بولی۔

وہ ایک دم ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔ یہ کوئی موقع نہیں تھا جواب دینے کا اور یوں بھی اس کا ذہن فوری طور پر اپنی مداخلت کے لئے الفاظ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ذہنی جھٹکا ضرور لگا تھا وہ اسٹیج سے تیزی سے اتر گیا۔

اس کا مطلب تھا اس روز اس کے کمرے کے باہر جو کھڑکا ہوا تھا تو وہی تھی اور فہد سے ہونے والی گفتگوں سب جلی تھی۔ ایک کرب اس کے دل کے اندر سرایت کر گیا۔ اسے لگا اس کا دل دکھ کی نامعلوم پاتال میں اترتا جا رہا ہو۔

گھر آیا تو خالی پن اور شکست خوردگی کا احساس رگ رگ سے اندر ہاتھا۔

اس نے جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

اسے تو کھو ہی چکے پھر خیال کیا اس کا

یہ فکر کسی کہ اب ہو گا حال کیا اس کا

وہ ایک شخص جسے خود ہی چھوڑ بیٹھے تھے

کھلائے دیتا ہے ملال کیا اس کا



فہد کے لندن جانے کی تاریخ آچکی تھی۔ وہ اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ ”تیمور دلا“ میں اس کے جانے والے لوگ سب ہی جمع تھے۔ ہلکی بھٹکی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شمن نے عید کو صبح سے ہی بلوایا تھا۔ وہ ان کا ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ فہد کی شرارتوں کی زد میں بھی تھی۔ فہد خوب چلبلا ہو رہا تھا۔ اس کی دیرینہ اور دلی آرزو جو پوری ہوئی تھی۔ سب نے ہی محسوس کیا اتنا خوش تو وہ اپنی غفلتی والے روز بھی نہیں تھا۔

وہ اماں جان کے کمرے میں بیٹھی تھی تب عمر اندر داخل ہوا تھا۔

”شکر ہے جناب کی صورت تو نظر آئی۔“ فہد اسے دیکھ کر چپکا۔ وہ دروازے پر

ایک بل رکھا تھا۔ وہ اماں کے پہلو میں بیٹھی اس کی آمد پر بے آرا می کی کیفیت میں کھڑی ہو گئی تھی۔

”دادا کہتی ہیں عمر تو عید کا چاند ہے مگر بھائی میرے عید کا چاند بھی سال میں ایک

”اس میں کوئی شک بھی نہیں۔“ وہ پلٹ کر مسکرا دیا اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

فہد نے ہلٹے پردے سے نگاہیں ہٹا کر بے اختیار اندنگہ عینیہ پر ڈالی جو تپتے تپتے چہرے کے ساتھ سر جھکا کر لبوں کا گوشہ دانتوں میں دبائے بیٹھی تھی گویا عمر کی موجدی نے اس کے دل کے تاروں کو پھیرا تھا۔ فہد کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بے مقصد مسکرا کر نکلی۔



فہد چلا گیا ”تیورولا“ میں خاموشیاں اتر آئیں۔ اس نے جاتے ہی فون پر اپنی خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی۔ مگر اس کے بعد مبینہ بھر ہو چلا اس کا نہ دوبارہ فون آیا نہ کوئی اطلاع ملی۔ عمر نے کئی بار رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر بات ہی نہ ہو سکی۔ پھر چند دن مزید گزرے کہ اس کا خط موصول ہوا۔ خط کیا تھا، ہم ہی تھا جو تیورولا اور احمد باؤس میں مشرک طور پر بیٹھا تھا۔

اس نے خط میں اپنی مغلکی کی اطلاع فراہم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”اس نے عینیہ سے رشتہ ختم کر دیا ہے اور وہاں لیزا نامی لڑکی سے مغلکی کر لی ہے۔“ لڑکی کے اس نے خوب قصیدے لکھے تھے اور مزید لکھا تھا کہ وہ شادی بہت جلد کرنے والا ہے۔

میں تو پھوٹ پھوٹ کر روئی مگر اسے دلا سا دینے والا کوئی نہیں تھا سب کے دل فہد کی اس حرکت پر غم سے نڈھال تھے۔

عمر اس خبر پر خاصا متعجب ہوا تھا۔ اسے فہد سے اس رویے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ تاہم اسے گھر والوں اور فہد کی فکر کی بجائے عینیہ کی فکر ستانے لگی۔

وہ پہلے ہی اس کے دیے ہوئے زخموں سے چور چور تھی، اس نئی افتادہ پردہ نازک سی لڑکی ٹوٹ پھوٹ ہی نہ جائے۔ اس کا دل چاہا وہ اذکر اس کے پاس پہنچ جائے اپنی اس

بار نظر آئی جاتا ہے۔“ وہ اسے چھینٹنے کی غرض سے بولا۔ وہ مسکرا کر اندر آ گیا اور ایک دھپ اس کے کندھے پر جمادی۔

”اب اتنی بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اور سنو نے کچھ ٹراؤز خریدی ہیں تمہارے بیڈ پر رکھ آیا ہوں اور تمہاری جیکٹ بھی آچکی ہے۔ کپڑوں کی پیکنگ خیال سے کرنا وہاں سردیاں بہت ہوتی ہیں۔“ وہ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولا۔

”عینیہ!“ فہد نے یک دم اس کی طرف رخ موڑا تھا اور اس پر ترش سی نظریں ڈالتے ہوئے اور دبی زبان میں مگر تحکم بھر سے لہجے میں بولا۔

”بیٹھ جاؤ، کہاں جا رہی ہو؟“

اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ فہد اسے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھ کر یوں یک دم ڈانٹ دے گا۔ خفت کے ساتھ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

عمر نے بس ایک نظر اس کے لال رنگ چہرے پر ڈالی اور فہد کی طرف متوجہ ہو گیا جو کبہر ہا تھا۔

”مجھے تو سی آف کرنے کے لئے لگتا ہے امی نے پورا محلہ اکٹھا کیا ہوا ہے اور مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں یہ بجوم ہیکراں اتر پورٹ پر دہشت گردی کے الزام میں دھریا نہ جائے۔“

عمر اس کی بات پر ہلکے سے مسکرا دیا۔ پھر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

”لو تم کہاں چلے؟“ اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”آپ باتیں کریں۔ مجھے ایک دو کام نہ مانے ہیں۔“ وہ عینیہ کے جھکے سر پر ایک ٹکا ڈال کر ٹراؤز کی جیبوں سے ہاتھ پھنسا کر پلٹ گیا۔

”جی ہاں کام تو سارے آپ ہی کرتے ہیں، ہم تو باتیں ہی بگھارتے ہیں۔“

کیفیت پر وہ خود بھی حیران ہو کر رہ گیا۔

دوسرے دن وہ احمر ہاؤس آیا تو ثمرہ اس سے لگ کر بچوں کی طرح رودی۔

”مجھے تو میرے کیے کی سزا ملی ہے عمر۔ مگر میری بچی کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟“ ثمرہ کے اس طرح بلک بلک کر رونے پر وہ پریشان ہو گیا۔

”مجھے معاف کر دو عمر۔“

”پھوپھو پلیز۔ ایسے تو مت کریں۔“ اس کا دل رنج سے شق ہونے لگا۔ وہ انہیں

تھام کر صوفے پر بٹھا کر ٹھٹھا پانی پلانے لگا۔

”فہد نے ایسا کیوں کیا عمر؟“

”حوصلہ کریں پھوپھو۔ میں خود جاؤں گا اس کے پاس اور اس سے باز پرس کروں

گا۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ عینہ کے ساتھ۔“ بولتے بولتے اس کی زبان ٹھٹھری گئی وہ لاؤ رنج کے دروازے کے پاس کھڑی استہزیائے آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے بس ایک نظرا سے دیکھا اور جلدی سے نگاہوں کا زویہ بدل کر ثمرہ کے کندھے کو تھپتھپانے لگا۔

وہ دروازے سے ہی پلٹ گئی تھی مگر اسے اندر باہر سے تہہ وبالا کر گئی۔

وہ آہستگی سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔ وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو وہ جھکی اپنی رائٹنگ ٹیبل کی دروازے سے جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ تھا جو اسے لگا جیسے یہ استقامت کی نہیں غصے اور خود آزاری کی کوئی کیفیت ہو۔

شدت غم شاید یونہی زہر بن جاتا ہے۔

کھٹکے پر اس نے چہرہ اٹھایا تو اسے دیکھ کر اس کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔ وہ پہلے

والی عینہ نہیں بلکہ ایک مختلف عینہ نظر آ رہی تھی جس کی بس میں زہر ہو۔ آنکھوں میں نفرت کی تپش تھی۔

”کیوں آئے ہو یہاں؟ ہم رومی کرنے تمہاریاں دینے آئو پونچھئے۔ تو سوری میری آئو تو اس روز سے خشک ہو گئے تھے۔ جب دل میں نے پہلا دھوکا کھایا۔ فہد کا یہ رویہ میرے لئے کسی رنج و غم کا باعث نہیں بنا۔“

وہ پھٹ پڑی۔ عمر فوری طور پر کسی طرح کا رد عمل ظاہر نہ کر سکا۔

وہ دراز کھٹکا سے بند کر کے سرخ چہرے کیساتھ خود ہی اس کی جانب بڑھی اور

اس سے کچھ فاصلے پر کمرے کے اس کے چہرے پر نگاہیں ڈال کر متفرجہ میں بولی۔

”مجھے فہد سے کوئی شکوہ نہیں ہے نہ میں اسے آئو بہاؤں گی بلکہ میں تو خوش ہوں کہ مجھے کسی بڑے نقصان سے پہلے ہی آپ دونوں مردوں کی اصلیت کا علم ہو گیا۔“

”عینہ۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ رنج موڑ کر ہلکی افسردہ منی کے ساتھ بولی۔

”ہاں، دکھ اس بات کا ہے کہ جسے چھاؤں سمجھ کر اتنا طویل سفر کیا گھٹنا سہا سبھاہ وہ

تجرتی دھوپ لٹکا لٹھا دینے والی۔ بھسم کر دینے والی دھوپ۔“

”عینہ پلیز۔“ اس نے تپ کر اس کا بازو پکڑا اور جھٹکے سے رنج اپنی طرف کیا تو

وہ بھڑگئی اور اس گرفت سے بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

”میں نے فہد کی رفاقت صرف اس لئے قبول کی تھی کہ اس میں میرے پورے گھر

والوں کی رضا تھی خوش تھی ورنہ میں اس رفاقت کو سراپ سمجھتی ہوں جس میں آدمی ہمہ

جاں شامل نہ ہو۔ شاید فہد جانتا تھا یہ بات اس نے بہت عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے اور شاید

میری رہائی بھی اس میں تھی۔ ہاں آپ میری خوشی کو ضرور شینز کرنا چاہتا تو کر سکتے ہیں۔

مگر میں اپنے دکھوں میں کسی کو شینز کر سکیں گی اجازت نہیں دے سکتی۔ خوشی میں تو

کھویا ہو تو پھر بے سکونی اور اضطراب زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میں بھی ایسی ہی اذیت اور بے سکونی میں گرفتار ہوں بغینہ۔ میری طرف دیکھو تمہیں دکھ دیکر ایک پل بھی سکون سے سو یا نہیں ہوں۔“

”جھوٹ بولتے ہیں آپ۔“ وہ چلائی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔

وہ لب بچھے اذیت آمیز احساس کے ساتھ اسے دیکھتا رہا پھر کمرے سے نکل گیا۔



تمام عمر کا اتنا سا گوشوارا ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسار ہے

اسے نئے سرے سے اپنے جرم کا احساس ستانے لگا تھا اور ایک بار پھر دل تمام تر شدتوں سے عینہ امر کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اسے لگا قدرت کی طرف سے اسے موقع ملا ہو۔ اپنے کیے کی تلافی کا، اس کو پالینے کا۔ مگر وہ اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی بلکہ کسی کی بھی بات سننے کو تیار نہ تھی اور جانے اس کی ساری انا بھی کہاں جا سوئی تھی۔ دیوانوں کی طرح وہ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

اس روز وہ کسی کام سے ”تیمور دلا“ آئی تو وہ لان میں بی گھر بیٹھا۔ اسے دیکھ کر وہ نفرت سے منہ پھیر کر جانے لگی مگر وہ بڑی سرعت سے اس کی بجائے کی راہیں مسدود کرتا ہوا اس کی راہ میں آ گیا۔

وہ بے چارگی آمیز کرب کیساتھ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیوں پیچھے پڑ گئے ہیں آپ میرے۔ خدا کیلئے مجھے اپنی مرضی سے جینے دیجئے۔“

غیروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے نا..... مگر آنسو صرف اپنوں کے سامنے بہائے جاتے ہیں۔ دکھ صرف انہی کے سامنے رویا جاتا ہے جو قریب ہوں اور مجھ سے صرف میرا دل قریب ہے، آپ سب غیر ہیں میرے لئے۔“

آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ لال انگارہ ہو رہا تھا۔ آہستگی سے دوسرا آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے ستاروں کی مانند نکل کر رخساروں پر گر کر ٹوٹ گئے۔

وہ پلٹنے لگی مگر عمر نے اس کے بازو پر گرفت مضبوط کر دی۔

”میں تم سے ہمدردی کرنے نہیں آیا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے دو لفظ تمہارے کسی بھی دکھ کا مداوا نہیں ہیں۔ نہ میں معافی مانگوں گا کہ یہ بھی تمہارے کسی کام کی نہیں میں تلافی کرنا چاہتا ہوں اپنے جرم کی۔“ وہ ہل کھا کر پلٹی تھی۔

”میں بکاؤ مال ہوں کہ فہد نے چھوڑا تو آپ۔“

”عینہ“

”سٹ اپ۔ نکل جائیں یہاں سے۔“ اس نے جھک کا دے کر اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑایا اور زور سے چلائی۔

”نفرت ہے مجھے آپ سے..... چلے جائیں خدا کے لئے“ چلے جائیں۔“ میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔

”کبھی یوں ہوتا ہے عینہ امر کہ جذبات کا طوفان تھم جاتا ہے اتنا پر پڑنے والی ضرب کی تھلاہٹوں کی روئی میں سستی آتی ہے تو سوچنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یہیں سے نفع و نقصان سود و زیاں کا احساس ہونے لگتا ہے غصے اور جذبات کے اس طوفان میں انتقام کے سیلاب میں کیا کھویا کیا پایا۔ یہ فکرا اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور اگر کھویا ہی

”تم نے جاب کیوں کر لی ہے؟“ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولا۔ وہ سنگ گئی۔

”مصرف رہنے کے لئے..... آپ کو کوئی اعتراض؟“ اس کی بات پر اس کے ہونٹوں میں ہلکی سی مسکراہٹ چمکی۔

”مصرف رہنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔“

”مثلاً۔“ اس کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔ کیوں یہ شخص اس کی جان پر بن آیا ہے۔ وہ تو اب اس کا چہرہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی بلکہ ساری دنیا سے کٹ کر رہ جانا چاہتی تھی مگر یہ شخص ہر بار نئے سرے سے اسی اذیت ناک دنیا میں کھینچ کر لے آتا تو وہ خود کو بھی بھول جانا چاہتی تھی مگر وہ اسے اپنے وجود کی موجودگی کا احساس دلانے جا رہا تھا۔

”مثلاً میرے بارے میں سوچو میرے ساتھ نئی زندگی شروع کرو۔ اتنی مصرف ہو جاؤ گی کہ.....“

’بند کریں یہ بکواس میں ایسا گھٹیا مذاق پسند نہیں کرتی۔‘ وہ طیش کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگی مگر وہ تو بے حد خوب صورت جذبوں کے ساتھ اسے تک رہا تھا۔ وہ اذیت کے عالم میں لب بھینچ کر رہ گئی۔

اس شخص نے اس بری طرح اس کے نازک جذبوں کی کونپلوں کو نہ روندنا ہوتا تو شاید یہ محبت بھری نگاہیں اس کے اندر پھول کھلا دیتیں۔ انگ انگ مہر کا دیتیں۔ مگر وہ اب اس احقانہ اور جذباتی دور سے گزر چکی تھی۔

وہ نادانی کا دور گزار چکی تھی۔ اب کسی طرح اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اسکا اعتبار بہت بری طرح توڑا گیا تھا اسے خود کو کمپوز کرنے کے لئے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت تھی۔ یا وقت کی۔ مگر وہ دانستہ سمجھنے نہیں چاہتی تھی خود کو ”پائل لڑکی محبت

بڑا خوبصورت نازک مگر اتنا ہی پاورفل جذبہ ہے۔ اس کی جڑیں کبھی نہیں سوکتی یہ اندر ہی اندر پھیلتا رہتا ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ تمہاری اندر میری محبت کی جڑیں سوکھ چلی ہیں۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ دھیمبا بھاری لہجہ اس کے دل میں تیز گھونپ سکیمیا۔ اس نے بڑی چھیتی نگاہوں سے اسے دیکھا وہ اسے پسپا کرنے کے تمام ہتھیار استعمال کر رہا تھا وہ گویا رو دیئے کوئی پھر یک دم اسے دھکیل کر بھاگتی ہوئی لان عبور کر گئی۔



ہمارا کیا کہ ہم بھڑے
بڑے ناداں بہت بے حس
سدا جو درد سے بو بھل
بہت وحشی بڑا خود میں
بس اپنے کرب سے واقف
کہاں فرصت کہ ہم سوچیں
کسی کے درد کو کھویں
کسی کی ہم کو کیا پروا
کسی کے غم سے کیا رشتہ
ہمارا دل نہیں رکتا
بہت طوفان جھیلے ہیں
نہ جانے کیوں مگر یہ دل
ٹھٹھک جاتا ہے بس ایک پل
کہ جب کوئی عنایت ہو

کسی بے لوث جذبے کی

منصفانہ سی عدالت ہو

پھر ایسے میں وہ ہر ایک غم

جسے ہم نے بھلایا ہے

وہ ہر چہ وہ ہر منظر

وہ سارا قرض جو باقی ہے

اچانک یاد آتا ہے

فصیل ضبط گریہ کو

گراتا ہے مٹاتا ہے

ہمارا دل نہیں رکتا

ٹھک جاتا ہے اک پل

کچھ ایسا اٹھ کر

اچانک ہم نے پایا ہے

تمہارے پیار کا جذبہ

تمہارا اک حسین تھک

اس نے بڑی بے بسی کے ساتھ گلابی کاغذ کو دیکھا جو جانے کب وہ اس کے گھر آ

کر اس کے کمرے میں رکھ گیا تھا۔ اسے غصے سے چھڑا تا چاہا مگر انگلیاں کچپکپا گئیں۔ اس

نے ایک بار نہیں کئی بار بلا ارادہ اس نظم کو پڑھا۔ پھر روح اور بڑھنے والی جھکن سے بے

حال ہو کر اسی پرچے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

تم بہت ظالم ہو مگر بہت ظالم۔

میں کیسے یقین کر لوں۔ کہیں یہ بھی غریب نہ ہو میرے اعتبار کو بہت روند گیا ہے
اب سکت نہیں ہے بار بار نکمرے کے عمل نے مجھے غم حال کرو یا ہے۔“

اسے لگا وہ اس شخص کے سامنے ایک بار پھر ہارتی جاری ہو۔ دل پھر تڑپاؤں کے
سیل شوق میں پہننے لگا ہو۔ دلی چنگاریاں بھڑک کر شعلہ بننے لگی ہوں۔

نہیں ہرگز نہیں! میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ اتنی ارزاں نہیں ہوں میری زندگی کہ
اسے تمہارے ہاتھوں کھلوتا بنے دوں۔“

اس نے اپنے آپ کو کسی کمزور لہر کے زور سے نکالا۔ اس کی آنکھوں میں پھر
نفرت کے شعلے اٹھنے لگے مگر اندر ہی اندر وہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھسے رہی تھی اور یہ بڑی
تکلیف دہ بات تھی اس کے لئے۔



دوسری صبح ہی وہ تیمور لا چلی آئی اور سیدھی اس کے کمرے میں آئی۔ وہ ابھی
نہا کر نکلا تھا تو لیے سے کیلے بال پونچھ رہا تھا کہ اس نے وہ خوشبو میں بسا پرچہ اس کے منہ
پر دے مارا۔

”کم از کم آپ کو ایسی بچکانہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ آپ اسکول بوائے نہیں
ہیں نہ میں وہ پہلے والی امحق سی عینہ احمد ہوں۔ جو اس طرح کے کھیل سے بہل جاتی تھی۔“

وہ اس حملے کیلئے تیار نہیں تھا۔ پرچہ اس کے چہرے سے مس ہو کر اس کے قدموں
میں گر گیا۔ وہ کسی طوفان کا روپ دھارے کھڑی تھی اور واقعی پہلے والی معصوم امحق سی عینہ

احمد نہ دکھائی دے رہی تھی بلکہ اب تو سیدھی دل میں اتر جانے والی روح کو مہکانے والی
محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ مٹ آئی۔

”امحق تو خیر تم اب بھی ہوا در پہلے سے کہیں زیادہ دل کش اور ہوش رہا ہو گئی ہو۔“
وہ اپنے حملے کے جواب میں اس طرح کے حملے کے لئے قطعی تیار نہیں تھی۔ شپٹا

گئی تاہم کھمکتے اعتماد کو کھینچتے ہوئے در جھکی سے بولی۔

”آئندہ آپ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔“

”کیسی حرکت؟“ وہاں وہی اطمینان تھا جو اس کے اطمینان کو غارت کرنے کو کافی تھا۔ وہ دانت چیس کر رہی تھی اور جبکہ کروہ کا غذا اٹھا کر اس کے آگے لہراتے ہوئے بولی۔
”ایسی۔“

اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے وہ پرچہ لے لیا۔
”کیا ہے بھلا اس میں؟“ وہ ایسی نظروں سے اسے دیکھنے لگا کہ اس کی پچلیں راز کر لکھ بھر رخساروں پر جھک آئیں دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

اچانک ہم نے پایا ہے
تمہارے پیار کا جذبہ
تمہارے درد کی قیمت
تمہارا اک حسین تھنہ

اس کی بھاری آواز جذبوں سے پر ہو کر اس کی سماعت پر برسی تھی۔ وہ پرچہ
تھا اسے دیکھنے لگا۔ دل میں بالکل بچا دینے والی لگا رہی تھی۔

”عینہ! وہ تمام تر شدتوں کے ساتھ اسے پکارنے لگا۔“ کیوں نہ ہم سب کچھ بھلا
کرنے سرے سے اپنی زندگی شروع کریں۔ میں اپنے فعل پر سخت ہنسنا ہوں۔ میں نے
یہ سب نہیں چاہا تھا اس طرح تمہیں دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس اس وقت میں
جذباتی ہو گیا تھا۔ طوفان گزر جائے تو بیٹھ کر اس کی تباہیوں پر رونے کی بجائے نئے سرے
سے تعمیر شروع کرنی چاہیے۔ نئے حوصلے اور امنگوں کے ساتھ پھر تباہ حال زمین کو رفتی
بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کے دل میں محشر بچا تھا اس نے کچھ کہنا چاہا کہ خود
بخود آؤ سوئل کر اس کے تپتے رخساروں پر کھمکھم آئے۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹی پھر پلٹ کر
سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔

وہ سخت دل برداشتہ ہو کر ہلٹے پر دے کود پھرتا رہا۔
مقاہمت کا تصور وہ شاید ذہن سے نکال چکی تھی۔ وہ کسی طرح اس کی خطا کو

معاف کرنے کو تیار نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر وہ بھی کسی صورت اس سے دست بردار نہیں ہوتا
چاہتا تھا۔ وہ اس کی روح کا حصہ بن چکی تھی۔ مگر اسے کوئی راہ بھائی نہ دے رہے تھے۔ کسی
طرح وہ اسے قائل کرے۔ کیسے اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دے جس میں اس کی
محبت بھری پڑی تھی۔

وہ سخت پڑھو گی اور دل گرگنی محسوس کرنے لگا۔ ایک بے چارگی آمیز کرب روح
کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔



”تیمور ولا!“ کی ساری روئیں دم توڑ چکی تھیں۔ ایک ویرانی درد و یار سے بچتی
محسوس ہوتی۔

اماں تو اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ٹخن الگ بولائی بولائی پھرتیں۔ کبھی عمر
کے پاس آ کر بیٹھ جاتیں جیسے بہت کچھ بھلا چاہ رہی ہو اور کہہ نہ پاری ہو۔ فہد کی اس حرکت
نے انہیں تیمور ولا میں سر اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ ہر کوئی جیسے پشیمان پریشان دکھائی
دیتا۔

اس روز ٹخن اس کے پاس آئی اور بے اختیار ہو کر رو پڑی۔
”عمر! مجھے معاف کر دو۔ مجھے لگتا ہے ان ویرانیوں کا سبب میں ہوں۔ میرے
ضمیر پر بہت بوجھ ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دم گھٹ جائے گا۔“
وہ اس صورت حال کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری
اقدام کیا کرے۔ تبھی اماں جان کمرے میں داخل ہوئیں اور ٹخن کو تمام کراپے پاس صوفے
پر بٹھالیا۔

ٹخن کو بھی یقیناً کسی ہمدرد و غم گسار کی طلب ہو رہی تھی وہ اماں کا کندھا پا کر
دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

مگر پریشان سابلوں میں ہاتھ بھیرتا ہوا کمرے میں پھر کاٹنے لگا۔
”عمر! عینہ تو بلا تقصیر کے اتنے عذاب سہ رہی ہے۔ اسے تم اپنا لود نہ میں تا عمر

خود کو معاف نہیں کر سکوں گی۔ میں غمخوار اور عینہ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں گی۔ مجھے وہ بہت عزیز ہے۔ مجھے اس کی سچی خوشیاں عزیز ہیں۔“

اس نے جگ سے پانی بھر کر ان کی طرف بڑھا دیا اور پھر خود ہونٹ بھیجنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ سخت قسم کی اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ تیمور دلا کی ہر آنکھ اس پر مچی ہو کر اٹھتی ایک آس لے کر جیسے اب وہی نجات دہندہ ہو۔ مگر وہ کیسے بتاتا کہ وہ لڑکی پھر جینی ہوئی ہے۔ اس سے اس بری طرح کبیدہ ہے۔

اتنی خود سری تو تم میں کبھی نہ تھی عینہ۔ یہ تم اتنی سخت دل کیسے ہو گئیں۔“ وہ پریشان ہو کر سڑکوں پر گاڑی دوڑانے لگا۔ پشیمانیات تھیں کہ بروقتی جاری تھیں۔ وہ اگر حقیقتاً خوش ہوتی وہ وہ یقیناً پیچھے ہٹ جاتا مگر وہ جانتا تھا کہ اب عینہ کو اس کے سوا کوئی نہیں سمیٹ سکے گا۔ وہ کھل اپنی انا کا خول چڑھائے بیٹھی ہے خود پر۔ اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور وہ اسے تمام عمر سلکے کڑھنے کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

وہ گاڑی سے ٹپک لگائے کھڑا تھا اس کے اسکول کے سامنے جہاں وہ آج کل پڑھا رہی تھی۔ اسکول آف ہونے پر باہر نکلے تو اسے دیکھ کر پکرا گئی۔ دوسرے بلے نظر انداز کرتے ہوئے سڑک کی طرف جانے لگی مگر وہ کراس کے قریب آ گیا۔

”جا کہاں رہی ہو چپ چاپ گاڑی میں بیٹھو۔“ اس کا لہجہ درست تھا۔

”اس زحمت کا مقصد؟“ وہ کڑے لہجے میں بولی۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے اسے پتہ کر دیکھنے لگا۔ دل تو جا ہا ایک زنانے دار و تحفظ بلکہ اس کے منہ پر دے مارے بیج بیج اب وہ اسے سمجھو کر کر رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہوں نے بہر حال اتنا کیا کہ وہ بغیر جیل و جنت گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی مگر بیٹھنے ہی چیتنے لگی۔

”آپ میرا چھوڑ دیں تو میری ہانسی ہوگی۔ میں آپ کی محتاج نہیں ہوں خود آ جا سکتی ہوں۔ بلکہ میں اب کسی کی بھی محتاج ہو کر نہیں رہنا چاہتی بہت کمر لپی سب نے اپنی سی اب مجھ پر کوئی اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے گاڑی اشارت کر کے سڑک پر ڈال دی۔

”آپ اس طرح دھونس دیتے نہیں سکیں گے۔“

وہ غڈا کرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور آہستہ سے بولا۔

”جیت میرا مقدر کہاں میں تو بہت پہلے ہار گیا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ ہارنا چلا گیا۔“ اس کے لہجے میں ہلکی آنچھی اس کی پلکیں رخساروں پر جھک گئیں وہ گود میں رکھے ہاتھوں کو کھورتی رہ گئی۔

کچھ آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی تھی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”عینہ اے“ کتنی بے تائیاں تھیں لہجے میں کہ اسے اپنا دل پہلو سے کھلا محسوس ہونے لگا۔ اسے اپنی دھڑکنیں رکھی محسوس ہوئیں۔ پلکیں اٹھائی جا رہیں مگر لڑکر جھک گئیں۔

”میں واقعی ہار گیا ہوں اور تمھیں چکا ہوں خود سے لڑتے لڑتے اور جیت تو یہ ہے کہ اب تمھیں کھو دینے کا بار بھی نہیں ہے۔“ وہ اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایک دم اپنا سر اسٹیرنگ وکیل پر جھکا گیا۔ اس کا لہجہ بے حد ٹوٹا پھوٹا تھا۔

”میں نے زندگی کو بڑے مختلف انداز میں جیتا ہے مجھ میں بھی ہر راہ ہیں مگر نفرتوں کی شدتوں نے مجھے بڑا کھنور بنا دیا تھا۔ میں نے سچی اتنی گہری بحثیں نہیں دیکھیں۔ سو مجھے بھی محبت کرنی نہیں آتی تم اچھی لگتی رہیں مگر اسے میں محض اچھا لگنا ہی سمجھتا رہا۔ مگر جب تم میری دسوس سے باہر ہو گئیں تو مجھے لگا کہ جیسے میں اپنی جیتی جیتی ستارے سے دست بردار ہو چکا ہوں۔ اندر سے بالکل خالی ہو چکا ہوں۔ تم ہند سے منسوب ہوئیں تو مجھے اپنے اندر کے انارٹسٹ مرد سے نفرت ہونے لگی کہ اس کے ذمہ میں میں نے تمھیں منوایا ہے۔ تمھیک کہتے ہیں لوگ..... انصافیتوں کے درمیان آ جاؤ تو بڑے فاصلے لے کر آتی ہے۔ انادو محبت ایک دل میں بھلا کیسے ہو سکتی ہیں۔“ اس نے کہتے کہتے سر اٹھایا تو گھبرا گیا وہ رونے جا رہی تھی۔ آنسو تو اسے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس کے دل میں تیرا سا پوسٹ ہو

”سوری.... سوری عینید۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“ اس نے جلدی سے ٹیوبکس سے چند ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے مگر وہ انہیں تھانے کی بجائے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اسے ہمیشہ کے لئے کھودینے کا احساس تو اسے بھی زندگی کی لذتوں اور خوشیوں سے عمر بھر کے لئے محروم کر رہا تھا۔ اب تو وہ بھی اسے کھودینے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے چہرے پر پشیمانی ندامت اور پشیمانی اس کے دل پر ضربیں لگانے لگیں۔ وہ بے اختیار اس کا ہاتھ تھام کر بچوں کی طرح بھل بھل رو پڑی۔

✓ - عمر - میں بھی تھک چکی ہوں۔ مجھے سمیٹ لیجئے میں کھر گئی ہوں اور جانتی ہوں آپ کے علاوہ مجھے کوئی نہیں سمیٹ سکے گا۔ میرے دل میں آپ کے علاوہ کسی کوئی آیا نہ آ سکے گا۔“ وہ اپنے اندر کی ساری تھکن اتار دینا چاہتی تھی۔

جو بھاگتے بھاگتے تھک جاتیں

وہ سائے رک بھی سکتے ہیں

چلو تو زود قسم اقرار کرو

ہم دونوں جھک بھی سکتے ہیں

عمر اسے کتنی دیر بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر جب اس نے روتے روتے سراٹھا کر اسے ہنگلی ہنگلی خوش گوار اور یقین دلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تو وہ سرورسا ہو گیا۔

یہ مسکراہٹ اچالہ بن کر اس کے اندھیرے کو کاٹنے لگی تھی۔ اس نے بھرپور ہنسی اور دلی آمادگی کے ساتھ اور تمام تر جذباتوں کے ساتھ اس کا ہاتھ چھتیا یا تو اس کے رخساروں پر شفقت پھوٹ پڑی۔ وہ اس کو ل کر ل کی طرح خود میں مٹ گئی۔

وہ بے حد سرور انداز میں گاڑی تیسور لایا بھاگنے لگا۔ وہ گھبرا گئی۔

”کیا کیا کر رہے ہیں آپ۔ کہاں جا رہے ہیں؟“

”گھر.... ٹمن اور اودی بہت پریشان ہیں انہیں تسلی تو دے دوں کہ آپ کی پوتی قابو میں آ چکی ہے۔“

اس کے انداز اور بات پر اسے ہنسی تو بہت آئی مگر مصنوعی خفگی سے گھورنے لگی پھر رنکمر سر جھکاتے ہوئے بولی۔

”مجھے شرم آ رہی ہے عمر“

”ہاں! آئی چاہئے۔ یہ تو ابھی بات ہے شرم کب بری چیز ہے۔“

وہ اس کی قطعی نسن رہا تھا اور تیسور دلا میں آ کر گاڑی روک دی۔

عینید کو ٹمن اور اماں کے حیران اور خوش گوار وجود کے پاس چھوڑ کر وہ خود تیزی سے اپنے کمرے میں آیا اور فون سٹینڈ کی طرف بڑھا کر کھنٹی چیخ اٹھی۔ دوسری طرف فہد تھا۔ وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

”میں ابھی تمہیں ہی کال کرنے والا تھا۔“ وہ ریسور اٹھا کر وہیں صوفے پر لیٹنے کے پہاڑ میں بیٹھ گیا اس کی بات پر اور کچھ لہجے کی بنشاشت پر فہد نے زور سے سٹی بجائی۔

”اس کا مطلب ہے نیا پار ہو گئی مبارک ہو دوست۔ ویسے بڑے دن لگا دینے ایک کمزوری لڑکی تم جیسے چھ فٹ کے مرد کے قابو میں نہ آ سکی۔ جج۔ میاں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔“

”معاملہ طاقت کا ہوتا تو بس لمحہ کی بات ہوتی مگر یہاں دل کا معاملہ تھا۔ جذبات اور احساسات کے زور پر جیتا جاتا تھا یار۔“ وہ اس کی بات پر محظوظ ہو کر خوش گوار ہنسی کے ساتھ بولا۔ اس کے لہجے کی تازگی سے ہی فہد اس کی خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔ پھر بولا۔

”بڑے خوش ہو مگر ادھر میرے لئے تو سوچو میں ایک آدھ کچر لگانا چاہتا ہوں مگر حالات سے باخبر کرو کہ کسی طرح خنوں کا سب سے ای تو شاید مجھے کھر میں مٹنے بھی نہ دیں گی۔ خیالی لیزر تو یقیناً دھماکا ہی کر ڈالا ہو گا۔“

”ایسا دیکھنا بے ساختہ ہنسنا۔ اب جج کی لیزر اڈھونڈ کر لے آؤ۔ کس نے روکا ہے۔ اس ڈرامے کو حقیقت کا روپ دے دی دو۔“ اس نے چڑایا اور وہ واقعی چڑ کر چیخا تھا۔

”اچھا بابا.... کچھ سوچتے ہیں کہ کس طرح اس ڈرامے کا ڈراپ سین کیا جائے۔“ اس نے مزید کہا کہ اچانک اسکی نظریں ثمن اور عینیہ پر پڑیں جو دروازے پر کھڑی اسے خون خوار نظروں سے گھور رہی تھیں۔ بھر عینیہ نے جھٹکے سے ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

عمر ہونٹ بھیج کر مسکراہٹ دبائے ثمن سے نظریں چرانے لگا جو مصنوعی غصے سے اسے گھورے جا رہی تھی۔

”چنیز... بے ایمان۔“ عینیہ فون پر فہد پر الٹ پڑی اور فہد عمر کی بجائے عینیہ کی آواز سن کر شیشا گیا۔

”تو دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔“ وہ چلائی دوسرے طرف فہد کا قبضہ بردستہ تھا۔ ”مجبوری تھی۔ تم کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھیں اور عمر صاحب کی صورت پر مجھے رحم آنے جا رہا تھا۔ ہائے ہائے محبت بھی کس کس طرح ذلیل اور خوار کرتی ہے اچھے خاصے مرد کو۔ اور سواب تمہیں خبر ہو چکی ہے تو میرے لئے میدان صاف کر دو تاکہ میں آسکوں۔“

”ہرگز نہیں۔ اب ہم گوری بھابی کے ہمراہ ہی تمہیں اتارنے دیں گے اپنی سرزمین پر۔“

”ہاں خواہ میں ان نازنیوں کے ناز اٹھانے میں مارا جاؤں۔“ اس نے جل بھن کر ریسیور رکھ دیا تھا عینیہ ہستے ہوئے پٹلی پھر ثمن کی طرف بڑھی اور بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

”دکھا آپ نے آنٹی، کس کس طرح ہم معصوموں کو دھوکا دیتے ہیں یہ مرد۔“ اس کی پگھڑی جیسے ہونٹوں پر کل کھلاہٹ تھی اور چہرے پر تازگی۔ ثمن نے اسے پلٹایا ہوا تھا۔ عمر کے لب بھی مسکراہٹ کو چھو گئے۔

اختتام

مکالمے وقرین

تیری طلب سب سے اٹھائے

آرکائیو